

# سُندِ رِچترال

سَلْمَى اَعْوَان

ناشران و تاجران کُتُب  
عزنی شریٹ نزد ویلز لہور

الفیصل

# سُندِ رِچترال

سَلْمَى اَعْوَان

ناشران و تاجران کُتُب  
عزنی شریف ناز و بلال زلالہ پور

الفیصل

اپنی بیٹی سعدیہ عمران  
اپنی بھتیجی نبیلہ رحمن

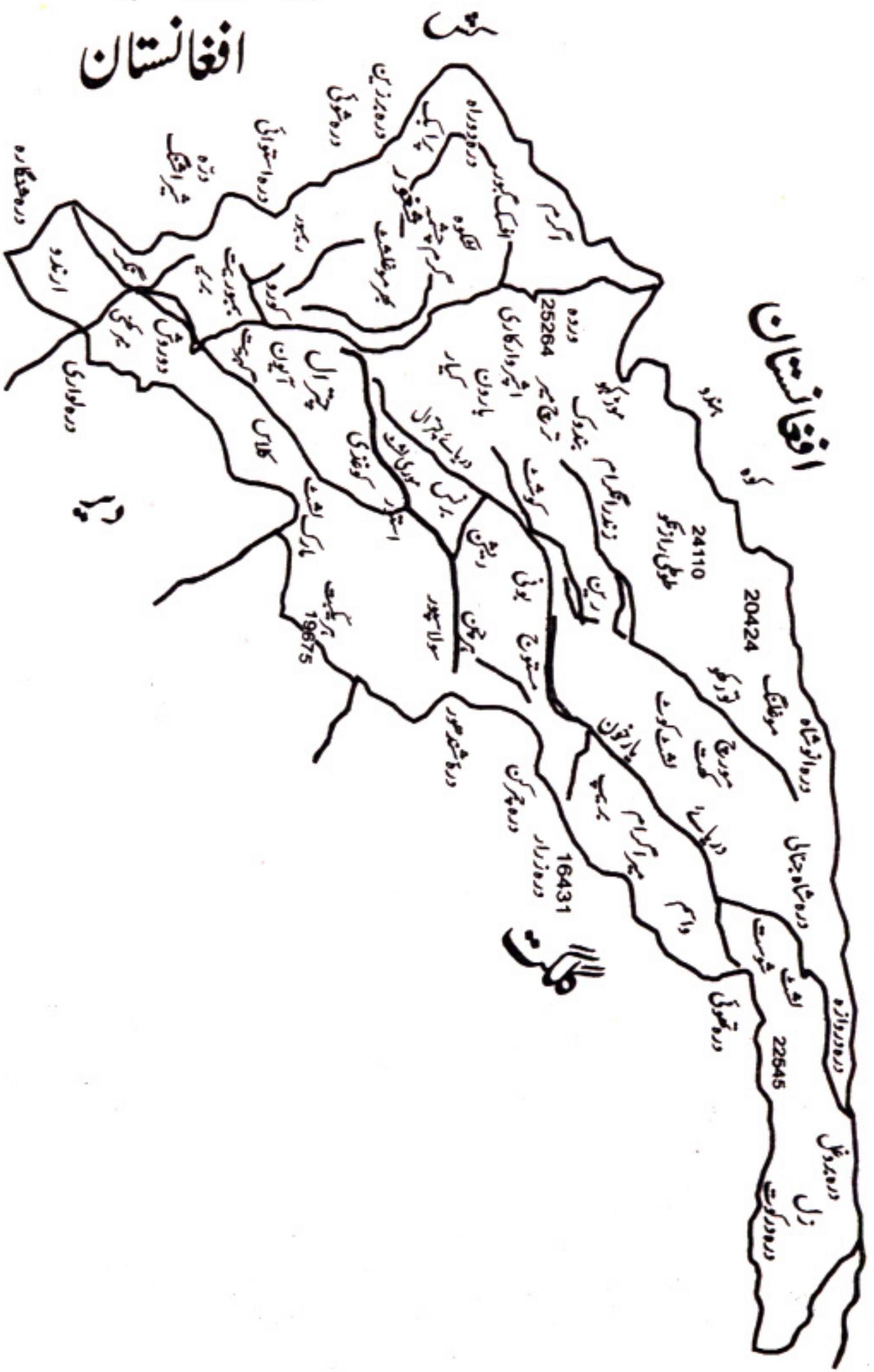
اور

چترالی بیٹیوں کے نام

## ترتیب

5	پیش لفظ	
9	ذرا سر زمین شہد ابالا کوٹ، سیف الملوک اور لالہ زار تک	باب 1
19	چترال شاہی قلعہ۔ مٹی خان اور کالا ش ڈرامہ	باب 2
39	کوہ قاف کی پریاں۔ یونانی لڑکیاں، کراکائل اور جستھاکن	باب 3
55	شنگھائے۔ بیشاکے پھول، ششاؤک ٹوالی اور دکن	باب 4
69	پریس کلب، شاہی قلعہ اور دینین کا ایک گھر	باب 5
75	شوگرام۔ سیار بابا۔ ریشن اور یارمن ہمیں	باب 6
93	وادی شغور۔ محل اور راجہ فیملی	باب 7
105	گرم چشمہ، موٹروے۔ لواری ٹنل اور بدخشانی گھرانہ	باب 8
115	دروش۔ لاوی اور غزالہ نگار اور ک زئی کانہال	باب 9
123	ریسبور۔ موت کا کھیل اقلاس اور جاپانی ایکو	باب 10
131	شندھور۔ پولومیلہ اور شوکن میلے دی	باب 11
165	پیراڈانزلاج۔ قلعہ مستوج۔ ٹوک اور بلوک۔ یونی کا ایک گھر	باب 12
185	بارون تریج میر اور میں	باب 13
195	گرم چشمہ۔ پری خوان بشر۔ پائین و بالا	باب 14
205	بھر موغلشٹ	باب 15
209	بریر۔ پوڑ میلہ۔ ڈین۔ بزشکی اور بودک	باب 16
225	الوداع چترال اور اہل چترال	باب 17

جمهوری بھارت  
افغانستان



۱۱

## پیش لفظ

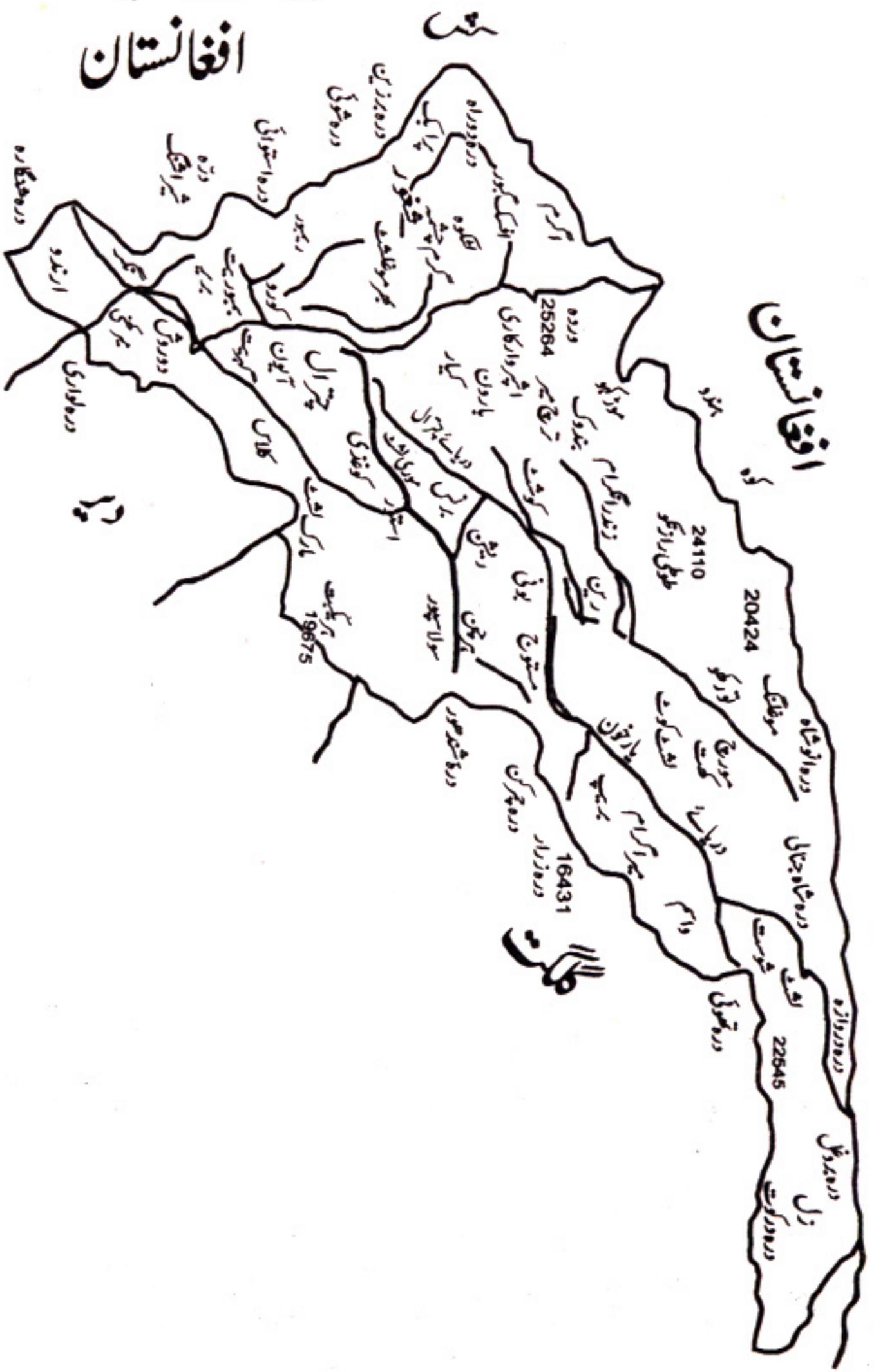
سالوں پہلے چترال سے متعلق دو واقعات میری ذہنی دیواروں سے یوں چمٹے کہ میں ایک مدت تک خود کو انکے سحر سے نہ نکال سکی۔ یہ جاتی بہاروں کی ہی ایک شام تھی جب ہم اپنے چھوٹے سے آنگن میں آگ پر ہو لیس (کچے چنے کے پودے) بھونتے تھے۔ ہماری اماں گھر میں داخل ہوئیں۔ بلند آہنگ آواز میں ”سبحان اللہ سبحان اللہ“ کہتے ہوئے وہ تیسری بار پھر سبحان اللہ کے ورد کے ساتھ گویا ہوئیں ”مولوی صاحب دلہن پر اہ کر لائے ہیں۔ سلفے کی لاٹ ہے۔ کمرے میں بیٹھی جگمگ جگمگ کرتی ہے۔“

سیدھی سادی اماں کے چہرے پر حسن کے سحر سے فسوں فیزی حیرت زدگی اور خدا کی خُسن تخلیق پر عیش عیش کرنے کا واضح رد عمل تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے ادیبز عمر مولوی صاحب علم صاحب ایمان اور صاحب کردار انسان تھے۔ میں نے کالک میں لٹھروے اپنے ہاتھ منہ صاف کیے اور انکے حجرے کی طرف بھاگی۔ دلہیز میں میرے قدم جیسے اوہابن کر مقناطیس کی کسی باڑ پر پڑے اور وہیں چپک گئے۔

سُرخ اوڑھنی میں اُس کے سنہری بالوں میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایسی نشلی ہری کچور شفاف بولتی آنکھیں کہ جن میں اُوب جانے کو جی چاہے۔ رعب خُسن سے میری بولتی کو اگر سانپ سونگھ گیا تھا تو وہیں میرے دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔

بچپن کی پڑھی گئی سب کہانیوں کی شہزادیاں اور انگریزی ناولوں کی خوبصورت ہیروئینیں

جمهوری بھارت  
افغانستان



؟

اور پرنسز دماغ کے کونے کھدروں سے نکل کر چوڑیاں بھرتے ہوئے اپنے آپکو موازنے لہے  
لیپیش کرنے لگیں۔

میں نے سر جھٹکا اور کچھ جاننے کے لیے پاس بیٹھی۔

”دور دور پہاڑ اور چترال“

یہ چند الفاظ تھے جو اسکے لعلین لبوں سے نکلے۔

وہ اور مولوی صاحب چترال سے بھی آگے کوئی ساٹھ میل پرے لٹکوه وادی کے ایک  
گاؤں سے تھے۔ پھر مزید شناسائی ہوئی۔ اُس نے بھی ٹوٹا پھوٹا بولنا سیکھ لیا تھا۔ ہمہ وقت محلے کی  
عورتوں سے ربط میں تھی۔ ایک دن ایک خوبصورت جوان لڑکا وہاں بیٹھے دیکھا جو اسکا چچیرا بھائی  
تھا۔

”اسکا ہاتھ دیکھو۔“ جونہی میں چٹائی پر بیٹھی اُس نے لڑکے کا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔  
میں اُس وقت بائیس تیس کے ہیر پھیر میں تھی اور پامسٹری کی کتابیں پڑھنے اور ہاتھوں پر طبع آزمائی  
کے جنوں میں ہمہ وقت پاگل ہوئے رہتی۔ لڑکے کے ہاتھ پر زندگی کی لکیر تو ٹھیک ٹھاک تھی پر  
حادثاتی موت کی ایک علامت جسے تھوڑے دن پیشتر میں نے کہیں پڑھا تھا موجود تھی۔

میں اگر اپنے اُس دور کے شب و روز کا محاسبہ کروں تو یقیناً کہوں گی کہ میں اسحق نہیں  
تھی۔ ماہ و سال کے مطابق ذہنی چنگلی بھی تھی تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں نے چھوٹے ہی کہہ دیا تھا کہ اسکی  
عمر تھوڑی ہے۔ یقیناً اسوقت میں نیم ملا خطرہ ایمان اور نیم حکیم خطرہ جان کی تفسیر بنی ہوئی تھی اور  
اپنے اُس محدود سے علم کی خود نمائی کے اظہار کے لیے بے قرار تھی۔

مجھے یاد نہیں میری اس بات پر اُن دونوں کا کیا رد عمل تھا۔

دو سال گزر گئے۔ میں ابھی بھی اُس پری ویش کے درشن کو جایا کرتی تھی کہ اسکے پاس  
بہت سی تحیر آمیز باتیں تھیں۔ ایسے ہی ایک دن اُس نے یکدم گفتگوروک کر مجھے بتایا کہ اُسکا وہ بھائی  
مر گیا ہے۔

”کیسے؟“ میرے سر پر جیسے بم پھٹا۔

”گاڑی چلا رہا تھا۔ آسمان کو چھوتے پہاڑوں کے ساتھ تنگ کچے راستے ساتھ میں گہری گھاٹیاں۔ رگوں میں خون خشک ہوتا ہے ان پر سفر کرتے ہوئے۔ کہیں لڑھکا اور گاڑی سمیت گہرے کھڈوں میں جا گرا۔“

یوں چترال میرے لیے ایک مدت تک خوف کی علامت بنا رہا۔

اہل چترال علمی بصیرت رکھتے ہیں۔ مہمان نواز اور منکسر المزاج ہیں مگر زوجہ بھی ہیں۔ میں عورت ہوں نسائی خوبصورتی کو دیکھ کر اُسے سراہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ چترالی لڑکیاں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ متین بردبار سلیقہ شعار علم حاصل کرنے اور خدمت میں پیش پیش ہیں۔ بھلا ایسی خوبیوں والی صنف کا ذکر کیوں نہ ہوگا۔

آخر میں اُن سب لوگوں کی ممنون ہوں اور شکر گزار بھی جنہوں نے مجھے اپنا تعاون

دیا۔

سلمیٰ اعوان



## ذرا سرزمین شہدا بالاکوٹ سیف المملوک اور لالہ زارتک

سچ تو یہ تھا کہ وہ صبح اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور نجلہ سامانیوں کے ساتھ آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی تھی۔ آسمان کے سینے پر آگے پیچھے دائیں بائیں بھاگتی دوڑتی اودی اور سیاہ گھٹاؤں کی یلغار تھی۔ سرسبز درختوں کی کمزور ٹہنیوں کے ساتھ کئی ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ لان میں اُگے موہے کے بوٹوں پر چنبیلی کی کلیاں کھل کر ٹگینوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ کیلے کے جھومتے پودوں کے بالائی حصے ہواؤں کے زور سے یوں تارتا رہتے تھے جیسے کسی خاتون نے پلو کی کشیدہ کاری کے لئے اسکے دھاگے نکال دیئے ہوں۔

اور میز پر دھری چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھنسی ہونے کے باوجود قبوے کی مسحور کن خوشبو کو باہر نکال کر پھینک رہی تھی۔ میں اس سارے منظر کو آنکھوں کے راستے دل میں اُتارتی کرسی پر بیٹھی۔ بیٹی نے چائے کا کپ بنا کر میری طرف بڑھایا جسے میں نے شدید احساس تشکر کے ساتھ تھاما کہ اس دل موہ لینے والے موسم میں بن مانگے چائے کا کپ مل جانا بھی کتنی بڑی نعمت تھی۔ اور جب میں نے سرشاری ہو کر بے حد رغبت سے سب لیا میں نے سنا بیٹی نے کہا تھا۔

”آپ بہت خود غرض ماں ہیں۔“

حیرت و تعجب سے میں نے اُسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔ مجھ جیسی devoted ماں تو پوری دُنیا میں نہ ہوگی۔ یہ تو میں جانتی ہوں یا میرا خدا کہ انکے

پالنے سے جوان ہونے تک دن بھر میں پسوں بار کرتے کا دامن اور ہاتھوں کے پیالے پھیلا پھیلا کر انکی تندرستی اور زندگی کی اوپر والے سے بھیک مانگتی رہی ہوں۔ ہونٹوں پر دعائیہ الفاظ تھرکتے ہی انکے لیے ہیں۔ لودیکھو بھلا کیسی ایکٹوٹی رہی۔

یقیناً میری آنکھوں میں چھلکتے شکوے اور دکھ کو اُس نے محسوس کر لیا تھا۔ پر وہ ان سے کوئی

اثر لئے بغیر بڑی قطعیت سے بولی۔

”اماں میں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جب آپکا جی چاہتا ہے اٹھتی ہیں بیک کندھے

سے لٹکاتی ہیں اور نکل بھاگتی ہیں کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں۔

گھومنے پھرنے اور سیر پانے کرنے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے۔ نئی جگہیں اور نئے لوگ دیکھنا

ہماری بھی آرزو ہے۔ لیکن آپکو کیا؟“

بھاپ اڑاتی چائے کی لطافت میں جیسے زہر سا گھل گیا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے

باہر کے حسین منظر پر ایک نظر اور اُسکے چہرے پر دوسری ڈالتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے

پوچھا تھا۔

”کیا یہ ٹھیک کہتی ہے؟“

اور میرے اندر نے پوری توانائی کے ساتھ اُسکے اس احتجاج کو رد کر دیا تھا۔ میری ممتا

بھلا اس گلاب چہرے کو ان کٹھنایوں اور دشواریوں میں کبھی ڈالنے کے لئے تیار ہوگی جنہیں میں

نے اپنا نصیب کر لیا ہے۔ اُسے یہ بتانا اور سمجھانا بھی کس قدر دشوار تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھاپے

کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی عورت کا ہاتھ اُسکے دل کی شریانوں کی طرح تنگ ہوتا چلا جاتا

ہے۔ اُسکے اندر کی کنجوس اور کفایت شعار عورت ایک وقت کا کھانا بچا کر پبلک ٹرانسپورٹ سے کبھی

پیدل اور کبھی لفٹوں سے سفر کر کے اپنے حسابوں توڑ جوڑ کر کے اعداد و شمار کی روشنی میں بڑی

سرشاری محسوس کرتی ہے کہ اُسے بڑے تیر مار لئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی پیسہ پیسہ بچاتی

اپنی حماقتوں سے روپوں کا پنڈرہ کر جاتی ہے اور اس ضرب المثل کو سو فیصد بچ کر دکھاتی ہے جس

میں کہا جاتا ہے۔ ”بندہ جوڑے پٹی پٹی اور رام لندھائے گیا۔“  
یہ آسائشوں کی گود میں آنکھیں کھولنے پلنے اور جوان ہونے والے نپے بھلا مجھ جیسی  
عورت کی اس نفسیات کو کیا جانیں۔

بیٹا آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر گیلری میں آیا اور بولا۔  
اب یہ بینکی پھینکی نہیں چلے گی اس بار سیر کرنی ہے۔ کاغان ناران لے چلیئے سوات کا  
پرگرام بنا لیجئے۔ مری کو چھوڑ دیجئے ہم اس کی صورت دیکھ دیکھ کر عاجز آ گئے ہیں۔  
میرا سانس جیسے سینے میں رُک گیا۔ سیر ڈھیر سارا خرچ اور حاصل وصول کچھ نہیں۔  
کاغان ناران عام رسائی والی جگہیں ہیں۔ اور میں لکھنے کے علاوہ سفر کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایک  
تیر سے دو شکار کرنے کی عادی ہوں خالی خالی تفریح کرنی میں نے سیکھی ہی نہیں۔ انگلینڈ امریکہ  
جانے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ڈھیروں لوگ گئے ڈھیروں نے لکھا۔ میں  
کیا لکھوں گی۔ کوئی انفرادیت کچھ نیا پن کوئی نئی چیز قاری کو نہیں دے پاؤں گی۔ زندگی میں اگر  
پیسے کی ریل پیل ہوگی تو پھر گھانا اور اسکا ویگلا دیکھوں گی۔ آسٹریلیا کے فنی کی سحر انگزیوں سے  
لطف اندوز ہوں گی۔ اور اگر جیب ہلکی رہی تو پھر پاکستان میں بھی بہت سے ایسے گوشے ہیں جن  
پر لکھا جاسکتا ہے۔

مگر ہوا یوں کہ سیر سپاٹے کی اس بیچ پر بیٹے نے فوراً انگز کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔  
اُس نے جارحانہ انداز میں مجھے الٹی میٹم دیا ”تیار ہو جائیے اور پیسوں کا بندوبست کر لیجئے۔“  
ساتھ ہی میری کزنز کو اُس نے فون کھڑکا دیئے۔ اپنی چچیوں کو بھی کہا کہ دعوت عام ہے اسکی اس مہم کا  
نتیجہ یہ تھا کہ چار عورتوں اور پندرہ بچوں پر مشتمل ایک قافلہ کاغان ناران کیلئے تیار ہو گیا۔

پنڈی سے چھوٹی خالہ کی تاریخ دان بیٹی فرح ناز نے ہمارے ساتھ شامل ہوتے ہی  
اس بے سرے قافلے کے نتھنوں میں نکیل ڈال کر مہار اپنے ہاتھوں میں تھام لی۔  
حد ہو گئی ہے۔ مہار لہجہ اشوک کے کتبے دیکھے بغیر تم آگے کیسے جاسکتے ہو۔ اُس نے

فیصلہ سنا دیا۔

مانسمہ کے قریب پتھروں پر کندہ ان عجیب و غریب تحریروں قراقرم ہائی وے پر گاندھیاں گاؤں میں شیوجی مہاراج بریڈی دیوی اور ”جٹی گئی“ کے مشہور ٹوٹے پھوٹے مندروں کو سوائے میرے اور فرح کے سبھوں نے کوفت اور بیزاری سے دیکھا اور ناک منہ چڑھاتے ہوئے اس کاوش کو وقت اور پیسے کا ضیاع قرار دیا۔

اشوک جی کی بھی آخری عمر میں کیسی کا یا کلپ ہوئی۔ کہاں جنگوں اور خون ریزی کا متوالہ جوان ہندو اور کہاں بڑھاپے میں بدھ مت کا بھکشو۔

وقت پیری گرگ ظالم سے شود پر ہیزگار

فرح اپنے کالج اور یونیورسٹی کی طرف سے بہت دفعہ ان راستوں کو ناپ چکی تھی۔ اس نے جب قابل دید جگہوں شراں، موسیٰ کا مصلیٰ، شینو کا مچھلی گھر، لالہ زار، جھیل لولو سر اور دودی پت سر کے نام لیے تو لڑکیوں کے قہقہے بکھرے آہا کس قدر طلسمی نام ہیں۔

صبح شوگراں کے لیے چلے پروگرام واپسی پر رات کیوائی میں ٹھہرنے کا تھا۔ مانسمہ سے گل ڈھیری تک بڑا سی کے جنگل کا زگ زگ جیسا راستہ بلند و بالا درختوں اور انکی مسکور کن خوشبو سے انا پڑا تھا۔ گل ڈھیری میں ہرے بھرے کھیتوں اور کوہ موسیٰ کا مصلیٰ نے فوراً توجہ کھینچی۔ گڑھی حبیب اللہ میں دریائے کنہار کے کنارے ٹال ہوٹل میں چائے پی گئی تصویر کشی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت گاؤں سے گزرتے ہوئے جونہی بالا کوٹ نظروں کے حصار میں آیا۔ میں بے کل ہو گئی۔ خورشید کی صورت جینے والے سید احمد شہید سید اسماعیل شہید کا مدفن بالا کوٹ جسے میرے بچپن کا معصوم تصور بلند و بالا ٹیلوں پر چمکتی تلواروں کے ساتھ پگڑیوں اور کرپانوں والے سکھوں کا مقابلہ کرتے دیکھا کرتا کہ میرے چچا کا ان دونوں سرفروش مجاہدوں سے والہانہ عشق ہر تیسرے چوتھے دن ان کے ذکر کے بغیر اذہمورار ہتا۔

رات کیوائی کی جگہ بالا کوٹ میں گزاریں گے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

کیوئی کی وادی نے خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ایک نئے منظر سے آشنا کیا کہ سارے گھر بلند و بالا پہاڑوں پر بکھرے پڑے تھے۔ شوگراں کوئی سات ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک ایسی دل کش سطح مرتفع ہے جو کیوئی سے اگرچہ نو دس کلومیٹر پر لیکن کھڑے ہاتھ جیسی ایسی عمودی چڑھائی کہ بندے کا سانس سینے میں رُک رُک جائے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے جنگل ایک جانب اور گہری کھائیاں دوسری سمت۔ دودھاری تلواریں جیسے اس راستے کے بعد جنت دیکھنے کو ملتی ہے۔ تا حد نظر سبزہ پھول خوشنما گھاس کوہ مکر اور سری پایہ کی چوٹیاں۔

پائین پارک میں ہماری کہاں ڈھوئی تھی۔ کہ مہنگے ریسٹورنٹ کے لیے ہماری جیب ہلکی تھی۔ پیٹ پوجا تو نیچے سے لانے والی چیزوں سے ہوئی۔ لڑکوں نے ”سری پایہ“ پر کوہ پیمائی کی اور واپس آ کر دیودار اور بیار کے گھنے جنگلوں اور خوبصورت پرندوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ داستان بھی سنائی۔ سینکڑوں سال پہلے ان علاقوں میں ایک عجیب الخلق شے کی حکمرانی تھی۔ ایک بار علاقے کے کھیا کی بکری کھو گئی۔ پورا گاؤں اُسے کھوجنے نکلا بکری یقیناً اس خونخوار کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ سیدھے سادے کھیا کے غم خوار لوگوں نے جس مقام سے بکری کی سری ملی اُسے سری اور جہاں سے پائے پائے گئے اُسے پائے کا نام دے دیا۔

واپسی پر کیوئی کی بجائے رات بالا کوٹ گزارنے کی میری بات پر فرح اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ پیچھے کیوں جائیں۔ کیوئی نہیں ٹھہرنا تو آگے پارس چلتے ہیں۔ میں نے مختصر ادوٹوک انداز میں کہا ”نہیں“۔

دراصل میں بھی اپنے جذباتی رشتے سے مجبور تھی۔ دریائے کنہار کے دونوں کناروں پر بسنے والے بالا کوٹ شہر کی شہرت تاریخ میں شہدا کی سرزمین کی ہے۔ سب کو ہوٹل چھوڑ کر میں اکیلی اسکی سیر کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ صدی پرانے چوٹی پل پر کھڑے ہو کر ان کوہساروں پر لڑی جانے والی لڑائی کا تصوراتی نظارہ تکلیف دہ تھا۔ عصر کی نماز جامع مسجد سید احمد شہید میں پڑھی جس کے ستون دریائے کنہار کے پانیوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ سید احمد شہید کا مزار دیکھ کر میں دکھ اور

کرب کی اتھاہ گہرائی میں گری کہ ایک عام ساحاطہ جس کے چھوٹے سے دروازے کی کنڈی کھول کر میں اندر داخل ہوئی تھی۔ جہاں درختوں کی چھاؤں تلے وہ مرد مجاہد ابدی نیند سوراہا تھا۔ مزار کے اوپر والے حصے میں پھول بوٹے سرہانے کتبہ اور اسکے ساتھ عربی عبارت والا لوہے کا ایک بڑا سا ڈبہ تھا۔ قبر کے تین سٹیپ تھے۔ سرہانے کھڑے ہو کر میں نے گیلی آنکھوں کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ احاطے میں دیگر قبروں کے لیے دعائے خیر کی اور بوجھل دل کے ساتھ باہر نکل آئی۔ میرا دل اس قومی بے حسی پر ماتم کناں تھا۔

شاہ اسماعیل شہید کا مزار چوک اسماعیل شہید سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے۔ جہاں جانے کے لیے مجھے سواری لینا پڑی۔

ڈوبتی شام اور چاروں سمت چھائی خاموشی میں ماضی اور حال کے تقابلی جائزوں میں آنسو دھڑا دھڑا بہتے تھے۔ فاتحہ پڑھنی مشکل ہو گئی تھی کہ چمن وطن میں ہوائے حرص و ہوس دیدہ وروں کے لیے موت کا پیام بن گئی تھی۔ گھورانہ ہیرا تھا اور روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ علی الصبح بالا کوٹ سے چلے۔ لڑکیوں نے شور مچایا شینو کا مچھلی گھر ضرور دیکھنا ہے۔ کیسا رنگ رنگیلا افسانوی سانام ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ دراصل یہاں ٹراؤٹ مچھلی کا فارم ہے۔ ساتھ ہی مزید کہا کہ جرید میں رُکیے۔ زانا نہ گرم شالیں خریدیں۔

جرید میں چائے پانی بھی پیایا گیا۔ شالیں بھی خریدی گئیں۔ اور اس جگہ کی سیر بھی

ہوئی۔

کاغان تنگ لیکن خوبصورت وادی ہے۔ ناران کشادہ اور جھیل سیف الملوک کا راستہ ہڈی پھلی ہلانے والا۔ لمبے چوڑے گلیشٹر کے ٹوٹے پر پیدل چلنا دلچسپ تجربہ تھا۔ فرلانگ بھر کی لمبائی والا بالشت بھر چوڑا راستہ جس کی گہرائیوں میں کنہار چنگھاڑیں مارتا بہتا ٹانگوں اور رگوں میں خون منجمد کرتا تھا۔ اس جان لیوا مشقت کے بعد جھیل سیف الملوک کسی حسین نازنین کی مخمور آنکھ کی طرح دکھائی دی۔ اور ساتھ ہی اُس بے مثل فقرے سے حظ اٹھایا جو ایک فیصل آبادی ٹولے

نے ماجھے سا جھے انداز میں ڈکراتے ہوئے کہا تھا۔

”آئے ہائے یہ سیف الملوک ہے۔ اس سے اچھا تو ہمارے چک کا چھنڑ ہے۔ یونہی

اتنا پیٹا مارا۔“

میں بے اختیار ہنسی تھی اور رُخ پھیر کر انہیں دیکھا تھا اور اس مقولے پر ایمان لائی تھی کہ واقعی کسی بھی چیز کا سُسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

جھیل سے متعلق داستان مقامی داستان گو سے سُنی جو الف لیلیٰ کی طلسمی کہانی سے

کیا کم تھی۔

لڑکے بابو سرناپ تک جانے کے لیے بھند۔ پر لالہ زار سے آگے نہیں جایا جاسکا۔ لالہ

زار بھی یادوں میں ہمیشہ کسی برقی فانوس کی مانند جھلملاتا ہے۔

بڑے کنڈی سے جیپ سڑک کے دائیں ہاتھ والے راستے پر اُتری۔ بچوں کی چال چلی

اور چار پانچ میل کے ٹوٹے کو کوئی گھنٹہ بھر میں طے کرنے کے بعد جہاں جا کر رکی اُس منظر نے مقامی لوگوں کی فہم فراست کی داد دی کہ جنہوں نے اسے لالہ زار کا نام دیا۔

بخدا کیا جنت کا نظارہ تھا۔ نکھری ہوئی فضا میں آنکھوں کو تازگی بخشتی سرسبز چوٹیاں رنگا

رنگ کھلے پھول اور انکی خوشبو سے مہکی فضا زمردیں چوٹی تو یوں نظر آئی تھی جیسے یہ سارا میلہ اسی شہزادی کے لیے ہی سجایا گیا ہو۔ ان پہاڑوں کے پار جھیل سیف الملوک تھی۔

لڑکوں نے مزید جگہوں کے لیے بڑا شور مچایا پر جوان اور خوبصورت لڑکیاں ساتھ

تھیں۔ راستے ٹیڑھے میڑھے اور دشوار گزار تھے اُن پر تنہائی اور سناٹے کی دھول تھی۔ دیورانی بول اُنھی۔

”باجی واپسی کریں کوئی اُنیس اکیس ہو گئی تو کس کی ماں کو ماسی کہیں گے۔“

بہترین ہونٹوں میں قیام و طعام اور دیگر اللے تلوں میں میری اور کزنز کی اولادوں

نے اتنا خرچ کروایا کہ حساب کتاب کے چکروں میں الجھ کر میں نے ایک بار نہیں پيسوؤں بار

شاید اپنے آپ سے کہا تھا۔ ”اس سے تو میں پورا پاکستان گھوم سکتی تھی۔“

میری زبان سے اسکی تکرار جب چند مرتبہ ہوئی تب ایک دن بیٹے نے دونوں ہاتھ بنتی کے انداز میں جوڑ کر میری ناک کی پھٹگی سے لگا دیئے اور سڑے سڑے لہجے میں بولا۔

”مانتے ہیں ہم۔ اتنے پیسوں سے آپ پاکستان کیا ساری دنیا گھوم سکتی تھیں بس ہمیں معاف کر دیجئے غلطی ہو گئی آئندہ ہماری توبہ ہمارے باپ دادا کی توبہ جو کبھی آپ کو ساتھ لے جائیں۔“

توبہ ہے آجکل کے بچے مجال ہے جو ناک پر مکھی بھی بیٹھنے دیں۔ میں بیٹے کے غصیلے لہجے پر بہت جزبز ہو رہی تھی۔

میرا سارا سال اسی ادھیڑ بن میں گزرا کس پر لکھوں۔ علاقہ غیر پر قلم اٹھاؤں۔ شہرت کے حوالے سے ایک بدنام نام میں نے نچھر جھری سی لی۔ کسی بااثر تعاون کے بغیر وہاں جانا جان جوکھوں کا کام۔ اندر خانوں کی کہانیوں پر دبیز پردے جنہیں باہر لانا یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

تبت کی طرف پیش قدمی کروں۔ وہاں کی زمین اور تہذیب دونوں میں بڑا سحر اور

اسرار ہے۔ کیا کروں کہاں جاؤں .....

## چترال شاہی قلعہ۔ مشی خان

### اور کالاش ڈرامہ

ابھی انہی گھنٹن گھیریوں میں اُبھی ہوئی تھی جب نیلم احمد بشر نے مجھ سے پوچھا کالاش چلتی ہو۔ پروین عاطف ڈرامے کے لئے اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں جا رہی ہیں۔ ملی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ساتھ مل رہا تھا۔ جانے کی ٹھان لی۔ پر ایک گھمبیر مسلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ بیٹی ایم۔ اے انگلش اور بیٹا بی۔ ایس۔ سی فائنل کے امتحان دے رہے تھے۔ کسی خیر خواہ نے کہا۔ ”عجیب اوندھی ماں ہو۔ امتحانوں میں بچوں کے کھانے پینے کی خصوصی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ انہیں مورل سپورٹ کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے اور تم ایسے نازک وقت گھر سے بھاگ رہی ہو۔“

بات تو ٹھیک تھی۔ پر ملازم پیشہ عورت کی مجبوریاں بھی مد نظر تھیں۔ میں نے بیٹی کو دیکھا اور پوچھا۔

”تم کیا کہتی ہو؟“

جھلستی دھوپ میں سے جیسے کوئی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں تلے آ جائے میری کیفیت ایسی ہی تھی جب اُسکے چہرے پر بچی اور آنکھوں میں پھیلی مہربان سی مسکراہٹ نے مجھے کہا

”نکل جائیے آپ۔ ہم اب کوئی بچے تھوڑی ہیں۔“

جانے کے لئے جو جھیلے سُننے کو ملے وہ میرے لئے قطعاً اجنبی تھے۔ پروین عاطف فون

پر بڑی دلگیری تھیں۔

مشی خان پلہ نہیں پکڑا رہی ہے وہ سید نور کی ”بلی“ کی شوٹنگ میں مصروف ہے میری ہزار خوار یوں کے باوجود تاریخ کا تعین نہیں ہو رہا ہے۔

تاریخ کا جب تعین ہوا تو شندھور میلہ آڑے آ گیا۔ غیر ملکی و ملکی سیاحوں بیورو کریٹوں اور حکومتی عہدیداران کی بھاری تعداد میلے کے سلسلے میں چترال بھاگی جا رہی تھی۔ اور پی آئی اے ہم جیسے ایرے غیرے نھو خیرے کو ٹکٹ دینے کے قطعی موڈ میں نہ تھی۔

آٹھ جولائی کو پروین عاطف کا فون آیا ”کل پشاور کے لئے روانگی ہے۔“  
”کل“ میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

”چلو تم دس کو پشاور پہنچ جاؤ گیارہ کو ہماری فلائٹ ہے۔“

اُسے درمیانی راہ نکالتے ہوئے مجھے پشاور میں اپنے دو عزیزوں کے پتے لکھوادئیے۔ میں تیاری کے لمبے چوڑے جھمیلوں میں کبھی نہیں پڑی۔ جب بریف کیس میں دو جوڑے رکھنے لگی تو بیٹی نے ہاتھ پکڑ لیا۔

”کچھ خدا کا خوف کیجئے۔ آپ اکیلی تو نہیں شوبز کے شوئی لوگ ساتھ جا رہے ہیں۔ کپڑے لے لے کا خیال کریں۔“

میں نے مسکینی سے اُسے دیکھا۔ میری نگاہوں میں مچلتا اضطراب اُس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اُس نے قدرے تیزی سے کہا۔

”جاتے ہی دھوبی گھاٹ لگانا ہے کیا۔“

بیگ میں پانچ کلف اور استری شدہ جوڑے رکھے گئے۔ میرے اندرون ملک سفروں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے لپ اسٹک پر فیوم کولڈ کریم اور پولی کلر کی ٹیوب ہینڈ بیگ میں ڈالی۔ کانوں کے لئے ایک جوڑی بندوں کی بھی رکھی۔ یہ اور بات ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔

جولائی کی جس اور اس سے بھری شب میں اسٹیشن سے ٹرین کمپارٹمنٹ تک بڑی ایکٹیوٹی رہی۔ اے۔ سی پارلر کی سیٹیں تھیں۔ میاں کا کوئی بیلی مل گیا۔ وہ وہیں پلیٹ فارم پر ہی اُسکے ساتھ ہیلو ہائے میں مصروف ہو گئے۔ باپ کی مصروفیت دیکھتے ہوئے بیٹے نے مجھے اے۔ سی اکانومی میں بٹھا دیا۔ سُرخ مٹلیں آرام دہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے اللہ کا شکر ادا ہی کیا تھا کہ میری اوقات اب کچھ بہتر ہو رہی ہے اور میں تھرڈ کلاس سے ون میں آ رہی ہوں۔ جب بھیڑ میں سے مجھے میاں کی گھائی نظر آئی جس پر نکلے اس کے چقدر کی طرح چہرے اور انگاروں کی طرح دکھتی آنکھوں اور منہ سے اُگلتے شراروں نے مجھے بتایا کہ میں غلط جگہ پر آ بیٹھی ہوں۔ میں نے نکھی اڑانے کے انداز میں داہیں بازو کو اٹھا کر فضا میں لہراتے ہوئے اُسے سگنل دیا کہ بس سب ٹھیک ہے۔ پراگلے ہی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے ذرا بھی حیل و حجت کی اور اپنا بیگ اٹھا کر نہ بھاگی تو کہیں جوش غضب میں مجھ پر ایر ریڈ ہی نہ ہو جائے۔ پلیٹ فارم پر میری دوڑ کی کیفیت کچھ نئے رنگروٹوں سے مختلف نہ تھی۔ جب اے۔ سی پارلر میں جا کر سیٹ پر بیٹھی تب میرا جی میاں کا بھرتہ بنانے کو چاہ رہا تھا۔ میری پشت پر پسینہ بارش کے قطروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ انتہائی اہتمام سے استری اور کلف شدہ قمیض اور ڈوپٹہ یوں پُخر مر ہو رہے تھے جیسے انہیں بکس کے کسی کونے کھدرے سے نکال کر پہنا گیا ہو۔

پر صرف پندرہ بیس منٹ کے وقفے نے مجھے اے۔ سی پارلر اور اکانومی کلاس کا فرق سمجھا دیا تھا۔ یہ فرق سمجھ آنے کے بعد میاں کو بھرتہ بنانے کو چاہنے والا دل شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ سبزی مائل نیلگوں شیڈ کے شیشوں سے میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے میاں کو دیکھا جس نے گاڑی کو وداع کر کے رخصت ہونا تھا۔ وقت انرجی اور آرام کے اس تیاگ کی میں کبھی قائل نہیں رہی۔ اسکی جگہ میں ہوتی تو خدا حافظ کہہ کر کبھی کی جا چکی ہوتی۔

پنڈی سے پشاور کے سفر میں بہت خواری ہوئی۔ لیاقت آباد والوں نے پیرودھائی کھیر لڑھکایا اور پیرودھائی والوں نے میونسپل کمیٹی والے اڈے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک بجے

کی چلچلاتی دھوپ میں بیگ کندھے پر اٹھائے مار دھاڑ کرتی ہوئی جس کوچ میں جا کر بیٹھی وہ اڈے سے بس نکل ہی رہی تھی۔ سیٹ بھی وہ ملی جو مالکان گاڑیوں میں اضافی لگوا لیتے ہیں۔ تاہم پھر بھی شکر ادا کرنے کی بات تھی کہ پشاور کی سڑکوں راستوں اور جگہوں سے اجنبیت کی بنا پر دن دیہاڑے وہاں پہنچنا بے حد ضروری تھا کہ دیئے گئے ٹھکانوں کو کھوج بھی کرنا تھا۔

راستے میں جن شہروں کا کھڑکی کے بیرونی شیشوں سے نظارہ کیا ان میں سے بیشتر کے ناموں سے بچپن کی کتابی شناسائی تھی۔ اکوڑہ اور انک کے قلعے کی عظیم الشان بیرونی فصیلوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ بڈایر بیس اور کاک شیل روڈ میں سے کسی ایک جگہ جانے کے بارے میں فیصلہ میں نے پشاور اتر کر کیا۔

”کاک شیل روڈ محمودہ آباد میں آپ آسانی سے جا سکتی ہیں۔ نزدیک ہی ہے۔“ کا سن کر میں نے بیگ رکشے کی سیٹ پر پھینکا اور اسی لہ گئی۔ پرانے پشاور کی گلیاں اور سڑکیں چھوٹے موٹے بازاروں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ بڑے سے سلور کے پتیلے پر رکھے سفید بھٹے جنہیں دیکھ کر خریدنے کو طبیعت للچائی۔ پر موقع کی مناسبت نے اس چنور پن کی اجازت نہ دی۔

محمودہ آباد میں رکشہ جس گھر کے سامنے رکا اُسکے بڑے سے گیٹ کے بند دروازوں اور موٹھیوں بردار دربان نے مجھے دہلیز سے ہی سمجھا دیا تھا کہ میں کسی امیر کبیر خان کے دروازے پر کھڑی ہوں۔ اس وقت جب جولائی کی تپتی سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ میں دائیں بائیں دیکھتی اور مرعوب ہوتی زنان خانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سرسبز بیلوں پھولوں اور پھلوں سے آراستہ زنان خانہ بڑا روایتی تھا۔ گھر کا لان اونچی نیچی پہاڑیوں کی طرز پر بنا تھا۔ لمبے برآمدے نے کمروں کی ساری گرمی کو جو اے۔ سی کی صورت باہر آ رہی تھی اپنے اندر جذب کرتے ہوئے چھوٹی سی دوزخ بنالی تھی۔ میں نے بیگ کو فرش پر رکھا۔ اور برآمدے میں نظریں دوڑائیں۔ آخری کونے میں کرسی پر وائر کولر پڑا تھا۔ مجھے دو چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ گلاس اور واش روم۔ گھر کے ایک حصے کی چھان پھٹک کے بعد مجھے دونوں چیزیں دستیاب ہوئیں۔ گلاس نمبرون اور واش

روم نمبر فوراً گر نمبروں نے ٹھنڈا ٹھار پانی اندر بھیج کر لطف اور شانتی دی وہیں نمبر فور نے گرم پانی کے اخراج سے سکون بخشا۔ ٹوٹے پھوٹے اس ہاتھ روم کی زنگ آلود ٹونٹی کا پانی اتنی خنکی لیے ہوئے تھا کہ منہ ہاتھ بازو اور پاؤں دھو کر مزہ آ گیا۔ میرا توجی نہانے کو چل رہا تھا پردروازے میں اتنی بڑی بڑی درزیں تھیں کہ حوصلہ نہ پڑا۔

وضو کر کے برآمدے کے فرش پر میں نے چادر بچھا کر نماز پڑھی۔ میں کوئی آدھ گھنٹے سے اس گھر میں گھوم پھر رہی تھی حیرت کی بات تھی کہ مجھے ایک متنفس دکھائی نہ دیا۔ گھر والے تو چلو مانا ٹھنڈے کمروں میں قیلو لے کا مزہ لوٹ رہے تھے پر ملازم وہ تہہ خانوں میں ہی کہیں ہو سکتے ہوں گے انکے امکانی ٹھکانے تو میں نے کھنگال ڈالے تھے۔

کرسی پر بیٹھ کر میں نے بالوں میں کنگھا چلایا۔ اور جب میں اپنے اودے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا سٹیج دے رہی تھی کہ بیچارے کچھ گلابی مائل ہو جائیں میں نے برآمدے کے آخری کونے میں جالیدار دروازے کا پٹ ہاتھ میں پکڑے ایک شائستہ سی خاتون کو اپنی جانب دیکھتے پایا۔ کنگھا لپ اسٹک اور شیشہ سب بیگ میں ٹھونس ٹھانس کر جلدی سے اٹھ کر اُن کی طرف بھاگی۔

سلام دعا کے بعد صرف مدعا بتایا۔

”اللہ پروین تو تمہارا انتظار کر کے ابھی کوئی آدھ گھنٹہ قبل گئی ہے۔“

کمرے کی لطیف خنکی نے میرے سارے شریر کو سرشار کر دیا تھا۔ چائے پی کیک کھایا۔ صاحب خانہ پشاور شہر کے سابق میئر تھے چند دن قبل امریکہ سے بائی پاس کروا کے آئے تھے۔ خاتون خانہ اُنکے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ کھانے پینے اور تھوڑی سی گفتگو سے فراغت پا کر میں نے قصہ خوانی بازار کے محل وقوع کے بارے میں پوچھا۔

”پشاور پہلی بار آئی ہیں۔“ سوال ہوا۔

”اپنی شادی کی شاپنگ میں نے یہاں سے کی تھی۔ کوئی چوبیس سال پہلے کی بات

”ہے۔“

”پشاور تو بہت پھیل گیا ہے۔ آپ اکیلی۔“ انہوں نے فکر مندی سے کہا۔

مجھے اُنکے اس تشویش بھرے انداز پر ہنسی آگئی تھی۔

دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے یہ کہنا ضروری سمجھا۔

”آپ قطعاً فکر نہ کریں۔ میں مغرب کی نماز انشاء اللہ آپ کے گھر میں پڑھوں گی۔“

سڑک پر آ کر رکشے میں بیٹھی۔ ریڑھی پر رکھے سلور کے پتیلے کے ڈھکن پر سجائے سفید

اُبلے بھنوں کے پاس اُسے رکوا کر بھٹہ خریدا۔ سچی بات ہے میں بڑی شادی ہوں۔ یہ شادی

سرائیکی زبان کے معنوی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی بلکہ یہ پنجابی زبان کے مطلب کی غماز

ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک بازاروں اور گلیوں میں ریڑھیوں اور خوانچوں پر سچی کھانے پینے کی

چیزیں ہمیشہ میری آنکھوں میں ندیدہ پن لے کر اتر آتیں۔ اٹھنی روپے کی خرید کر سدا میں نے اپنا

چسکا پورا کیا مگر اب عمر کے ساتھ ساتھ آگے کو تو ند نکالتا پیٹ بڑھتے ہاتھوں اور چنچارے لیتی زبان

کو تھوڑا بہت قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ قصہ خوانی بازار میں چلی کبابوں کی پاگل کر

دینے والی خوشبو کو اک ذرا رک کر میں نے سونگھا پر خریدا نہیں۔ یوں یہ اور بات ہے کہ میں نے

چاہا کہ آدھا کباب خرید لوں پر شرم آڑے آگئی۔ خدا یادو کا ندر کیا سوچے گا کیسی شوم عورت ہے۔

بازار سے میں نے چترال پر چند کتابیں خریدیں۔ اور جب سورج ڈوبنے کے قریب تھا میں گھر

لوٹ آئی تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد اُنکا بیٹا مجھے بڈا بیر میں پر پروین عاطف کے پاس چھوڑنے لے

گیا۔ پروین وہاں اپنے دیور کی بیٹی سویرا کے پاس ٹھہری تھی۔ رات کی تاریکی میں بڈا بیر میں کی

شان و شوکت کا تو مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا پر جس گھر میں داخل ہوئی وہ خاصا جدید اور خوبصورت تھا۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں نے بیگ زمین پر رکھا اور پروین کے اٹیچی کیسوں اور بڑے بڑے

بیگوں پر نگاہ ڈالی۔ جب میں پروین کے گلے لگ کر اُس سے اظہار محبت کر رہی تھی اُس نے تعجب سے

میرے مختصر بیگ کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔

”بس یہی تمہارا سامان ہے۔“

”یہ بھی زیادہ ہے۔ اس میں پانچ سوٹ ہیں جو آپکے آرٹسٹوں کی نظر میں معتبر بننے کے لئے زبردستی رکھے گئے ہیں وگرنہ میں تو دو جوڑوں کی عادی ہوں۔ میرا بس چلے تو جینز پہن کر اوپر سے چادر اوڑھ لوں۔ چادر سے ملٹی پر پزز حاصل ہوتے ہیں۔ جائے نماز بیڈ شیٹ دسترخوان وغیرہ وغیرہ۔“

لاؤنج میں ادھر ادھر بکھرے پروین کے قوی الجشہ بے ہنگم اور بے سکتے بیگوں اور اٹیچی کیسوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے اختلاج قلب سا ہونے لگا تھا۔ ڈھائی چھٹائیک کی پروین ان دیوہیکلوں کو کیسے سنبھالے گی۔ ان ڈھیر ساروں کے لئے کتنے پورٹرڈر کار ہوں گے۔ میں خلوص اور مروت کی ماری اس صورت حال سے کیسے اور کیونکر نمٹوں گی۔ میرے ذہن کے تنور سے اُلٹی پلٹی تلخ اور مضطرب سوچوں کے سلسلے ایک کے بعد ایک چھلائیں مارتے یوں باہر آ رہے تھے جیسے

The Great Escape کے جنگی قیدی سرگم کے سوراخ سے قلابازیاں

کھاتے باہر نکلتے تھے۔

بے چینی نے مجھے کھڑا کر دیا تھا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چہرہ لے کر باہر دیکھا۔ گھب اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔ چائے کی ٹرالی میرے سامنے آئی۔ سویرا نے کپ بنا کر مجھے تھمایا۔ رغبت سے سب لے کر میں نے اس کو فٹ کو کم کرنا چاہا جو میرے قلب و ذہن پر چھا گئی تھی۔

”چینی باجی آپ کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ پر آپکا یہ بوجھ اٹھانے میں میں ہر

گز آپکی مدد نہیں کروں گی۔ خدا کے لئے انہیں ہلکا کریں۔“

میں نے ”سختی نالوں سوم بھلا جیڈ اثرت دیوے جواب“ والی پالیسی پر عمل کرنے کا

فیصلہ کر لیا تھا۔

”ڈارلنگ پروین کے لہجے میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔

مجھے تو تمہارے اوپر رشک آ رہا ہے۔ اسوقت سے میں یہی سوچ رہی ہوں کہ میں اس

وزن کو کیسے گھٹاؤں۔“

پشاور سے چترال کے لیے جہاز میں بیٹھنے سے قبل چیکنگ سکریننگ اور جہاز کی

سیڑھیوں سے آگے دروازے تک کے مرحلوں میں میں نے اپنی تمام تر چلا کیوں اور ہوشیار یوں

سے اپنے آپ کو کھڑکی کے ساتھ سیٹ لینے کے چکر میں گھما پھرا کر آگے آگے رکھا۔ پر اس ساری

تنگ و دو پر پانی پھر گیا جب ایر ہوسٹس نے بورڈنگ کارڈ مانگا جو مجھے جلدی میں سٹیورڈ سے لینا یاد

نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً نیچے جانا پڑا۔ اور جب واپس آئی پروین عاطف کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر

قبضہ جما چکی تھی۔ ہانپتے ہوئے میں سیٹ پر ڈھسے گئی۔

ارے میں نے قدرے دکھ سے سوچا۔

پروین کی زندگی جہازوں میں چڑھتے اترتے گزر گئی ہے۔ ایک گھنٹے کا یہ سفر اسکے لئے

کیا اہمیت رکھتا ہے خیال تھا وہ ضرور کہے گی تم ادھر آ جاؤ۔ پر جب ایسی کوئی بات نہ ہوئی اسوقت

میراجی چاہا کہ میں جیمز بانڈ کے سائل میں مکا مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دوں اور پروین کو گچی سے

پکڑ کر نیچے پھینک دوں اور خود مزے سے اسکی سیٹ پر براجمان ہو جاؤں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جہاز اڑان لے چکا تھا۔ میں نے بیلٹ بھی نہیں باندھی

اور ہمسائی کے کندھوں پر جھکتے ہوئے باہر نظر بازی بھی نہیں کی۔ چپ چاپ بے حس و حرکت سر

پشت سے نکائے بیٹھی رہی۔

جونہی پرواز ہموار ہوئی خوش شکل ایر ہوسٹس اور سٹیورڈ نے چائے کے لئے سروس

شروع کر دی۔ برگر بند اور کیک کا پیس۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامتے ہوئے پروین نے کہا۔

”سویرا کے گھر کا ناشتہ ابھی تک میرے سینے پر دھرا ہے۔ اسے پیک کر لیتے ہیں دوپہر

اور شام کے کھانے کی بچت ہو جائے گی۔“

ماشا اللہ خیر سے یہ میری بھی پونٹلیں۔ مجھے ہنسی آگئی تھی جسے میں نے کمال ضبط سے روکا۔ یوں میں اندر سے خوش بھی ہوئی کہ اللہ کے فضل و کرم سے خیالات میں کافی ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے۔ اگر سفر کے ہر موڑ اور رخ پر ایسی ہی دوراندیشی سے کام لیا گیا تو شاندار نتائج برآمد ہوں گے۔

اور جب ہم دونوں پیکنگ کر رہی تھیں میں نے دیکھا تھا میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا مرد ہماری اس کاروائی کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے طنزاً مسکرا رہا تھا۔ اُسکے بچوں کے چھوڑے ہوئے بند برگر ایر ہوٹس اٹھا رہی تھی۔ یوں ہم نے بھی اپنے شوگر بیگز پی۔ آئی۔ اے والوں کو واپس کر دیئے تھے۔

دور سے جو نظارے دیکھنے کو ملے اُن میں بادلوں کے پُرے برفانی چوٹیاں لواری ٹاپ کی ایک چھوٹی سی جھلک پتلی سی لکیر کی مانند بہتے دریا، گڑیوں کے گھروندوں کی مانند مکان اور سب سے آخر میں جہاز کا دریائے چترال پر پرواز کرنا تھا۔ جونہی جہاز نے زمین کو چھوا میں نے شکر کا لبا سانس بھرا تھا۔ چترال کے لئے فوکر جہاز مخصوص ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے کے فوکر اب بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ لواری ٹاپ پر ذرا سی دھند نہیں آگے کی بجائے پیچھے لے جاتی ہے۔ اور آپ جہاں سے چلے تھے وہیں آن کھڑے ہوتے ہیں اکثر آپکا سارا شیڈول اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔

ایئر پورٹ کی چھوٹی سی عمارت سیاہ پر ہیبت پہاڑوں میں گہری تنگینے کی طرح چمکتی تھی۔ تیز ہواؤں سے نہال ہوتے ہوئے میں نے تنقیدی نظروں سے ایئر پورٹ کا جائزہ لیا۔ اور بے اختیار سوچا کیا اسے بونگ طیاروں کے لئے وسعت نہیں دی جاسکتی ہے۔ گلگت ایئر پورٹ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ پروردگار کوئی مرد آہن اس قوم کو نصیب ہو جو میدانوں صحراؤں اور پہاڑوں کو نتھ ڈال دے۔

چھوٹی سی عمارت کے شیشوں والے دروازے میں داخل ہونے سے قبل کیاریوں میں

اگے رنگارنگ پھولوں اور سیبوں کے بار سے جھکے درختوں نے جھوم جھوم کر جیسے سرگوشی میں کہا ہو۔  
خوش آمدید چترال آئی ہو۔

اس اتنے پیارے استقبالیہ جملے پر انکا شکر یہ ادا کرتے ہوئے میں اندر داخل ہو گئی تھی۔  
ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا ایک شراب اوپر سے دو آتش جیسی مثالوں کی پروین کے  
وجود کے ساتھ عملی موزونیت کا احساس مجھے چترال ایرپورٹ سے ڈپٹی کمشنر کے دفتر تک بہترین  
انداز میں ہوا۔ پروین خوبصورت لکھاری کیلاش پرٹی وی کے لئے سیریل بنانے کی ٹگ و دو میں  
مصروف اوپر سے ہاکی کے بین الاقوامی شہرت کے حامل بریگیڈیئر عاطف کی بیوی۔ اب وہ اپنی  
جس خوبی کو جہاں چاہتی کیش کرواتی یہ اُسکی مرضی تھی۔ ایرپورٹ کے کمرے میں اسکے بھاری  
بھرم بیگ بھی سنبھالے گئے اور اسٹنٹ کمشنر اظفر بہ نفس نفیس دینین روڈ پر ریٹ ہاؤس میں  
چھوڑنے بھی آیا۔ آرٹس پارٹی کل کی فلائٹ سے پہنچ رہی تھی۔ انکے لئے گاڑیوں کا بندوبست  
بھی فی الفور ہوا۔ انتظامیہ کی جانب سے ہر طرح کے تعاون کے وعدے پر اُسنے سکھ کا لمبا سانس  
بھرا۔ بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹی اور بولی۔

”سلمیٰ لنچ کرتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔“

معدے کی مریض پروین جس کا کھانا چڑی کے چوگے جتنا ہے اسوقت لنچ کرنے اور  
چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیوں نہ کرتی کہ اجنبی جگہ پر اُسکے گھمبیر مسائل الہ دین کے جن  
کی طرح مقامی حکام نے حل کر دیئے تھے۔ میں نے اپنے بیگ سے چینی پتی اور دودھ نکالا۔ سائیڈ  
ٹیبل پر رکھی تھرموس میں دو کپوں کے حساب سے چیزیں ڈالیں اور گرم پانی کے لئے کچن میں گئی۔  
اسوقت ریٹ ہاؤس کے دو خانسے اشتہا انگیز کھانے پر سونے میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔  
ملحقہ کمرے میں بھاگم دوڑ جاری تھی۔ میں نے بوتل میں پانی ڈالا اور ناک بند کرتی اپنے کمرے  
میں آ گئی۔ دو گھروں کا لنچ نکالا۔ سویرا کے دیئے ہوئے شامی کباب اور سلائس ٹوٹ پھوٹ کے  
عمل سے دو چار تھے۔ یہی حال پی۔ آئی۔ اے کے برگر بندوں کا تھا۔ روکھے سوکھے سلائس چائے

کے گرم گھونٹوں کے ساتھ حلق سے نیچے اُتار کر رُب کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مفت کا یہ من و سلوئی ہمیں دیا۔ ساتھ ہی ہمسایوں کو بھی لعن طعن کی کہ وہ کھانے کے لئے لان میں کھیلتے اپنے بچوں کو آوازیں دے دے کر بلا رہے ہیں کبخت یہ نہیں دیکھتے کہ برابر میں دو عورتیں بھی انکی نظر کرم کی مستحق ہیں۔ ہمسایوں کے تو بڑے حقوق ہوتے ہیں۔

چار بجے ہم ریٹ ہاؤس سے نکل آئیں۔ اب میں نے چترال کے ناک نقشے پر توجہ مرکوز کی۔

کوہ ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑوں میں چاروں طرف سے گھری ہوئی یہ وادی اپنی چند خصوصیات کی بنا پر ہر سیاح کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شور مچاتا کف اڑاتا دریائے چترال شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ چُوی پل پر کھڑے ہو کر شہر کا نظارہ کریں یا کسی اور جگہ سے شاہی مسجد کے بلند و بالا مینار اسکا مغلیہ طرز تعمیر اسکے شاندار گنبد سنگ مرمر اور سرخ اینٹیں آپکو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اسکی مشابہت شاہی مسجد لاہور سے جوڑیں گے۔ کسی اونچی جگہ کھڑے ہو جائیں تو پچیس ہزار فٹ سے بھی بلند تر تریچ میر کی برف سے ڈھنپی چوٹی خوبصورت اور منفرد نظر آتی ہے۔

پروین نے گروسری کی خریداری کرنی تھی ایک جنرل سٹور سے جب وہ دال چاولوں کے چکر میں اُلجھی۔ میں گھبرائی شاپنگ سے مجھے ہمیشہ کی چڑ ہے۔ میرے اُلجھے ہوئے استفسار پر وہ بولی تھی۔

”یار کالاں میں چیزیں بہت مہنگی ہیں یہاں سے لے جانے میں کافی بچت ہو جائے گی۔“

اُن سے ایک گھنٹے کی آوارہ گردی کا کہہ کر میں چُوی پل پر آ گئی۔ یہ پل وزیراعظم بھٹو کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ چُوی ایک کیلائی شہری تھا۔

گد لے پانیوں والا دریائے چترال شور مچاتا بہتا ہے۔ دریا کے دائیں ہاتھ مستوج

روڈ ہے جو بونی تک پکی اور شندھور تک کچی۔ بائیں ہاتھ ایئر پورٹ روڈ ہے۔ پل کے ساتھ ہی پہاڑ کا جھکاؤ اتنا خطرناک ہے کہ بس یوں لگتا ہے جیسے ابھی لڑھک کر آپکے اوپر آ جائے گا۔ یوں تیز بارش اور دھوپ سے اسکے کھوہ میں کھڑے ہو کر بچا جا سکتا ہے اکیلے ہونے کی صورت میں ایئر پورٹ جانے والی کسی گاڑی میں مفت کی لفٹ بھی مل سکتی ہے۔ پل سے اتالیق بازار تک کا راستہ کوئی پون گھنٹے میں طے ہوا۔

بڑے بڑے دروازوں والی دکانیں اور لمبی لمبی داڑھیوں والے دوکاندار گاہکوں کو پنپانے میں مصروف تھے کہیں کہیں نو خیز گل رنگ چہرے بھی بھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے تھے۔ بازار کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ ہر پچاس گز پر بازار کا نام تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاہی بازار، کڑوپ رشت بازار، نیو بازار، اتالیق بازار۔

پجاردوں کی جتنی فراوانی مجھے چترال بازار میں نظر آئی وہ میرے لیے حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ مسرت بخش بھی تھی۔ واپسی کے لئے میں نے ایک پجارو میں ہی لفٹ لی۔ چھو پل اتری اور پولوگر اوڈر روڈ پر بڑھی جہاں میں پروین کو چھوڑ کر گئی تھی۔

ماشائے اللہ چاول دالوں چینی اور دیگر الم غلم چیزوں سے بھرے اُسکے شاپر ایک نئی دوکان کھولنے کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ میری صورت پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی۔

”سامنے والی دوکان سے آدھ کلو آلو خرید لو رات کے کھانے کے لئے۔“

”سبحان اللہ کتنا شاندار ڈنر ہوگا۔“ اپنے آپ سے کہتے ہوئے میں سبزی والی دوکان

کی طرف ہوئی۔ جب پاؤ بھر آلو ٹل رہے تھے پروین نے میرے پاس آ کر مجھے مزید ایک نوید سنائی۔ ”قریب ہی میں نے تنور دیکھا ہے۔ دونان وہاں سے پکڑ لیں گے۔“

سوزو کی میں ہماری اور سامان کی لد لدائی کے ساتھ ساتھ دونانوں کو بھی مکمل عزت و احترام کے ساتھ جگہ دی گئی۔

ریسٹ ہاؤس سنسان تھا۔ مرغن کھانوں والی فیملی کوچ کر گئی تھی۔ اور باورچی خانے

میں اُلو بول رہے تھے۔ سرونٹ کو ارٹر میں سے خانسامے کو ڈھونڈ کر لائی اور آلو اس کے حوالے کئے۔ ایک نظر اُس نے مجھ پر اور دوسری آلوؤں پر ڈالی اور سر جھکا کر چولہا جلانے لگا۔ اُسکی نگاہ مجھے کہہ گئی تھی ایسی شادی زانیاں تو میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ گھی پیاز اور نمک اسنے لوگوں کا پچایا ہوا ڈالا آلو اور مرچیں ہماری ڈالیں۔ یوں ڈنرتیار ہوا۔ پروین نے چپہ کھایا میں نے آدھا اور جب باقی نان میں انہیں عنایت کرنے گئی تو دیکھا دونوں خانسامے دوپہر کا بچا ہوا مرغ گوشت اور پلاؤ کھا رہے تھے۔ کھیانی ہنسی ہنستے ہوئے واپس آ گئی۔

چترال کی اُس اولین شب کو سونے کے لئے لیٹتے وقت میرا جی چاہا کہ سارے کپڑے اتار پھینکوں۔ میری جس کزن نے موٹے کپڑے لے جانے کا مشورہ دیا تھا ابھی جا کر اسکی چھترول کروں۔ پروین نہا کر لیٹی تھی اور شاید کچھ سکون میں تھی۔ میں نہانے کی ازلی چور بس رات بھر گرمی سے گتھم گتھا ہوتی رہی۔

غریبانہ سے ناشتے سے فراغت پاتے ہی میں پروین سے یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی کہ اب ایئر پورٹ پر ملاقات ہوگی۔ پروہاں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ کتابوں کی دوکان پر دس بجتے ہی لوگوں کی آسمان کی جانب اٹھتی نگاہوں زبانون اور ایک دوسرے سے یہ استفسار ”کیا فلائٹ آئی ہے؟“ نے مجھے سمجھا دیا کہ پروین کی دعائیں کام نہیں آئیں۔

اتالیق بازار کے پل پر ریلنگ کے ساتھ ٹک کراک ذرا میں نے نیچے بہتے نالے کے پانی کی روانی کو دیکھا۔ نگاہوں نے لشکارے مارتی دھوپ میں لامحدود وسعتوں والے شفاف آسمان کی سیاہی مائل نیلاہٹوں پر نظر کی۔ پروردگار کی رفعتوں اور عظمتوں کے اس پُر اسرار اور پُر ہیبت اظہار پر میری نظریں زیادہ دیر جمی نہ رہ سکیں فوراً ہی خوفزدہ سی ہو کر سکڑیں اور جھک گئیں۔

پتہ نہیں مجھے وہاں کھڑے کتنی دیر گزر گئی تھی پھر جیسے مجھے محسوس ہوا کہ کوفت بیزاری اور ڈپریشن سا بجلی کی کسی ننگی تار سے نکتے مدھم کرنٹ کی طرح میرے سارے سریر میں دوڑنے لگا ہے۔ میں مفلوج ہو رہی ہوں۔ پروین عاطف کے پروگرام اور اسکے منصوبے مجھے اُن بونوں اور رسوں

کی مانند نظر آ رہے تھے جنہوں نے گلیور کو جکڑ کر زمین پر چاروں شانے چت گرا دیا ہو۔ میں زمانے بھر کی آپ پختہ ری جب بھی باہر نکلی ہمیشہ اپنے حسابوں چلی۔ دائیں بائیں اور پیچھے نہیں دیکھا۔ آگے دیکھا۔ چترال کے نقشے اور لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے کہاں کہاں جانا چاہیے۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ اڈے پر چلی جاؤں اور جولاری گاڑی جہاں بھی کہیں جا رہی ہو اس میں لد جاؤں۔

شہزادہ مطاع الملک کے ہاں وادی شغور میں وادی گرم چشمہ وادی دروش بھر موغلٹ جیسی دلا ویز جگہ ہیں۔ شندھور میلہ میں اپنی لاعلمی سے مس کر بیٹھی تھی کہ جانتی ہی نہ تھی کہ ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر شندھور جھیل کے ہمسائے میں وسیع و عریض سطح مرتفع پر کھیلے جانے والے پولو ٹورنامنٹ کو دیکھے بغیر آپکا چترال آنا اور اس پر کچھ لکھنا ادھورا رہتا ہے۔

کیلاش اور اس کی وادیاں بمبوریت اور ریمبور کا سلسلہ تو پروین کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔

دفعنا مجھے محسوس ہوا آتے جاتے مقامی لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اُنکی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے چلنا شروع کر دیا۔ چلتی گئی چلتی گئی۔ پجاروزن زن کرتی میرے قریب سے گذرتی گئیں مگر میں نے کسی کو ہاتھ نہیں دیا۔ مجھے کونسا کہیں حاضری دینی تھی۔

چیونیل کے پاس ریٹ ہاؤس کا نوکر جس ہاتھ میں پکڑے ڈی۔ سی آفس کی طرف جاتا نظر آیا مجھے دیکھ کر رُکا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ایسا ممکن ہے آج تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو میں وہاں رات گزارنا چاہتی

ہوں۔“

وہ ہنسا۔ میں نے دیکھا تھا طنز سے بھری ہوئی زہریلی ہنسی اُسکے ہونٹوں سے پھسلتی اسکی آنکھوں میں گری اور وہاں سے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ اور جب اُس نے رخ پھیر کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟“

مجھے محسوس ہوا تھا زہرا کے لہجے میں عود آیا تھا۔

”کچھ جاننا چاہتی ہوں تم لوگوں کے بارے میں۔“

میں نے اپنے سامنے بہتے دریائے چترال اور شور مچاتی موجوں پر نظریں جمائے

جمائے کہا۔

”ہمارے پاس غریبی کے دکھوں کے سوا ہے کیا جس کے لئے آپ وہاں جانے کی

خواہشمند ہیں۔ میرے بوڑھے باپ نے سولہ سال کی چھوٹری سے بیاہ کر لیا ہے۔ اُس چھمک چھلو

نے میری بیوی اور بچوں کو نتھ ڈال رکھی ہے۔ میرا باپ ایسا زن مرید کہ مجال ہے جو ایک لفظ بھی

بولے۔ سارا وقت تو تو میں میں اور کل کلیان میں گزرتا ہے۔ پھر وہ بڑی قطعیت سے بولا۔

وہ بڑی باجی وہاں ریٹ ہاؤس میں بہت پریشان بیٹھی ہیں۔ جہاز نہیں آیا تا۔ انکے

لوگ نہیں پہنچے۔ آپ جا کر انہیں تسلی دیں۔“

ریٹ ہاؤس کے ٹی۔ وی لاؤنج کی میز پر کچی کلچی شاپروں میں لپٹا چھوٹا اور بڑا

گوشت لہسن اور پیاز کے پیکٹ بکھرے پڑے تھے۔ یہ خریداری پروین نے سویرے سویرے کی

تھی۔ دوکان میں پو پھٹے کھل جاتی ہیں۔

چترالی صحت کے اُس زریں اصول ”جلدی سوؤ اور جلدی اٹھو“ کی عملی تفسیر ہیں۔

صوفے پر بیٹھی پروین چپ چاپ دروازے سے باہر لان میں پھیلی دھوپ اور اس دھوپ میں

نہاتے سامنے پھیلے پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے خالص مسلمانی طریق سے پروین کی دلداری

کی۔ ”اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی اسمیں بھی باجی۔ چھوڑیے آئیے چائے پیتے ہیں۔“

چائے کے گھونٹوں میں اگر میں نے اپنا پوشیدہ اضطراب حلق میں اتارا تھا تو یقیناً

پروین نے بھی ایسا ہی کیا تھا کہ جب ہم نے کپ تپائی پر رکھے تو خاصی ہشاش بشاش تھیں۔

باہر بہت گرمی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ٹھیک ایک بجے ہم نے لنچ کیا جو بلا

شبہ ہماری اوقات کے مطابق تھا۔ تھوڑا سا آرام کرنا ضروری سمجھتے ہوئے لیٹیں۔ تین بجے جب ہم

باہر نکلیں تو جن ہواؤں نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا وہ اگر دوزخ سے نہیں تو جنت سے بھی نہیں نکلی تھیں کہ تند و تیز ہونے کے ساتھ ساتھ نیم گرم بھی تھیں۔ شاہی مسجد کے اندر پروین میری ترغیب پر گئی۔

”چلو نہ چل کر دعا مانگتے ہیں کہ کل آپکا جہاز آ جائے“۔ یہ عصر سے پہلے کا وقت تھا مسجد میں فقہ حدیث اور قرآن پاک حفظ کرنے والے بچے ٹولیوں کی صورت ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے سے کچھ ڈر لگا چترالیوں کی مذہبی وابستگی کی شدت سے آگاہی تھی۔ خوف تھا کہ کہیں نکالی ہی نہ جائیں۔ صد شکر کہ خیریت رہی برآمدے میں کسری نماز پڑھی۔ جب ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے تو کھلی آنکھوں نے مسجد کے اندرونی حصے کے نقش و نگار کی دلفریبی کو دیکھا لیکن وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں کسی ذی روح یا کسی شے کے دنیاوی حسن سے متاثر ہونے یا داد دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ پروین بھی آنکھیں بند کئے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا مانگ رہی ہے۔ ہاتھوں کے پھیلانے اور سکیڑنے میں صرف دوپل ہی لگے ہوں گے۔ جب میں کھڑی ہوئی مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرے اور اوپر والے کے درمیان دوبارہ دنیا داری کے دبیز پردے حائل ہو گئے ہیں۔

شاہی مسجد سے نکل کر ہمارا رخ شاہی قلعے کی طرف تھا۔ وہی مغلیہ طرز تعمیر شمالا مار باغ کے مین گیٹ جیسا دیوہیکل پیتل کے کیلوں والا چوہی دروازہ۔ ویسی ہی چھوٹی سی کھڑکی جس سے اندر داخلہ ہوا۔ دائیں بائیں درمیانی راستے کو چھوڑتے ہوئے دو ڈھائی فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی کرسی پر بھاری بھر کم ستونوں کے آگے جو کوٹھڑیاں امتداد وقت کے ہاتھوں خورد مردہور ہی تھیں یہ کبھی پہرہ داروں اور سنگین برداروں کی آماجگاہ تھیں۔ آج جو ہم یوں دندناتے اندر داخل ہوئے تھے کہیں سو سال قبل میرا اندر دھرا پہلے قدم والا پاؤں انکی بندوقوں کی زد میں ہوتا۔ داہنے ہاتھ والا زینہ اوپر بالکونی میں جاتا تھا۔ بالکونی کے تختے بھی سال خوردہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔ تاریک ڈیوڑھی کے آگے چوہی دروازے سے نکل کر کشادہ میدان نظر آتا ہے۔ بائیں ہاتھ

کی فوجی بارکیں مکمل طور پر زمین بوس ہیں۔ دائیں ہاتھ کے مخروطی برآمدوں والے کمرے جو کبھی حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کے لیے مختص تھے آج بھی کسی قدر قابل قبول حالت میں ہیں۔ سامنے والے کمروں کی منفرد طرز تعمیر کی صرف ایک ہلکی سی جھلک یہ بتاتی تھی کہ یہ خاص کمرے ہوں گے اور واقعی یہ مہتر چترال کا دفتر مالیات تھا۔ آنگن میں چنار کے بلند و بالا درخت کے نیچے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ڈھولچوں سازندوں اور موسیقاروں کی جگہ تھی جو کبھی یہاں اپنے فن کا جادو جگاتے ہوں گے پر اب تو چنار کے خاموش کھڑے درخت کے سوا اگر کچھ تھا تو وہ ویرانی سناٹا خوف اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس۔

دائیں بائیں سے نگاہیں اٹھا کر سامنے پھینکیں تو ٹوٹ پھوٹ کا وہاں بھی ایک ایسا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جولہروں کی صورت دکھ اور کرب سارے شریر میں پھیلاتا جاتا تھا۔ میں بھی اسی کرب کے بوجھ تلے سکتے ہوئے مختصر سی راہداری سے اگلی سمت آئی تو سامنے کا منظر کسی قدر مسحور کن تھا۔ موڑ کا ثناء دریاے چترال اور دوسرے کنارے پر چمکتے ٹین کی چھتوں والے خوبصورت گھر۔ اس حسین نظارے سے آنکھیں سیکنے کے بعد دائیں طرف کی نگاہ پھر یاس کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ طویل راہداری پر مشتمل اوپر کی منزل کی بالکلونی جہاں مہتر چترال کھڑے ہو کر عوام کو اپنا دیدار کرواتے اور خطاب کرتے تھے۔

بیچاری غریب عوام مہتر کے قدموں سے تیس فٹ نیچے کھڑی ہوتی۔ پر زمانہ ماضی کا ہویا حال کا مہتر ہو حاکم ضلع یا کوئی اور بڑا آدمی۔ یہ فاصلہ تو آج بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ داہنے ہاتھ کی چوٹی بالکونیوں سے اگلے کمرے جو چوب کاری کا بہترین نمونہ تھے وزراء کے لیے مخصوص تھے۔ آگے تہ خانے قیدیوں کے لیے اُنکے ساتھ ہی بلند و بالا بُجیاں بندوق برداروں کے لیے کہ دریا پار سے کوئی دشمن حملہ نہ کرے۔

ماضی کے اس شگفتہ ٹوٹے پھوٹے قلعے سے ٹرن لے کر جب آگے بڑھیں تو گیردے رنگ کی دو منزلہ برآمدوں اور شہ نشینوں والی عمارت نظر آئی۔ پہلی منزل کے برآمدے اگر پرانی

توپوں کے نمونوں سے سجے ہوئے ہیں تو بالائی منزل کے برآمدوں کی دیواریں مارخور جنگلی گائے کے سینگوں سے مزین ہیں۔ بجری پتھی روش پر آگے چلتے ہوئے ڈیوڑھی میں بچھے بیچ پر جس آدمی نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ہماری پذیرائی کی وہ ادھیڑ عمر ضرور تھا پر آواز کی گھن گھرج اور لہجے کی کرخت تو اتائی اُسے معمر کہاں ظاہر کرتی تھی۔ دہل کر میں پیچھے ہٹی۔ قلعے میں آنا منع ہے۔ اُسکی نیلی کچور آنکھوں میں برہمی اور سُرخ و سفید رنگت میں خون جیسی لالی تھی۔ میں نے مسکینی اور عاجزی سے مدعا گوش گزار کرنا چاہا جب کسی خونخوار بگیاڑ کی طرح اسکی ”نہیں“ قلعے کے طول و عرض میں گونجی۔ سہم کر میں نے پروین کی طرف دیکھا جس نے زیر لب اُسے لعن طعن کرتے ہوئے مجھے کہا آؤ چلیں۔

میں نے گھائل نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے جیسے کہا۔ ”آؤ چلیں۔ کہاں اور کیوں اپنی باجی۔“ آپکی جیب میں پرنس محی الدین کا جو کارڈ ہے یہ کب کام آئے گا۔ میں قلعے کے اندر محل میں جانا چاہتی ہوں۔ جہاں اس جیالے مہم جو اور بہادر پرنس سیف الرحمن کی پری پیکر محبوبہ ہے جو دیر کے نواب کے کسی بیٹے کی منگیت تھی۔ وادی کی سڑکوں پر سپورٹس کار دوڑانے اور ان خوفناک پہاڑوں میں جہاز اڑانے والے اس شہزادے نے سینہ تان کر کہا تھا۔ وہ میری پسند ہے۔ اسے کوئی مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے۔ اور اسکی اس بات پر ریاست دیر اور چترال ایک دوسرے کے مد مقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ مجھے تو اُسے دیکھنا ہے اس سے باتیں کرنی ہیں۔

پرنس محی الدین سے ہی تو ملنے جا رہی ہوں۔ انہوں نے میری دل گرنگی کم کرنے کی کوشش کی اور جب ہم قلعے کی کچی دیواروں کے ساتھ باہر جانے والی سڑک پر رواں تھے ہمیں وہ جرمن ملے تھے انہیں بھی اُس نیلی کچور آنکھوں والے سے شکایت تھی۔ ہلمٹ روسومیر

Rosemaire اور Holfelner سے کافی دیر ہاکی اور سیاست پر باتیں

ہوئیں۔ میرے چہرے پر بشارت آئی کہ میں ایک نئے منظر میں داخل ہوئی تھی۔ زرگراندہ محلے میں چترال کی اہم سیاسی شخصیت پرنس محی الدین کی سرگرمیوں کا مرکز ایک لمبی چوڑی عمارت اور

لان کی صورت سامنے تھا۔

یہاں خدام بھی بہترے تھے اور چائے پانی کی بھی فراوانی تھی۔ پر صاحب کے بارے میں معلومات کی بہت کمی تھی۔ سیاست اسی کا نام ہے۔ لان میں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی جب گیٹ سے ایک لینڈ کروزر اندر آئی اور اس میں سے ایک ہنستا مسکراتا دلدار سالڑکا برآمد ہوا۔ جو شندھو رٹاپ سے آرہا تھا۔ لمبے اور دشوار گزار سفر کی گرد لینڈ کروزر اور جوان چہرے پر چھائے ہونے کے باوجود دونوں جوانی کی بشاشت اور تازگی سے پور پور بھرے پڑے تھے۔ پروین سے تھوڑی دیر گپ شپ۔ بابا کے بارے میں مکمل لاعلمی۔ اب یہ پروین کی خوش قسمتی کہ جب واپسی کے لیے نکل رہے تھے پرنس محی الدین کی پجاروزن سے پاس آرکی اور پھر الہ دین کے طلسمی چراغ کی طرح گاڑی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اور جب چترال کا چہرہ تاریکی کی زلفوں سے گہنارہا تھا ہماری مارچ پاسٹ دینین ریٹ ہاؤس کی طرف رواں دواں تھی۔

چترال ایئر پورٹ پر مشی خان کی آمد لوگوں کے لیے جیسے خوشبو کا ایک خوشگوار جھونکا تھی۔ اب ایسے میں اظفر جیسے نوجوان اسٹنٹ کمشنر کا ایئر پورٹ پر گھومنا اور اپنی باجی کو خوشدلی سے گاڑیاں فراہم کرنا سمجھ میں آتا تھا۔

پنی باجی نے لمبا سانس بھرا تھا اس سانس کے ہر تار میں شکرے کے جذبات تھے۔ کہ ازکا عمل آگے پیچھے کے دونوں جہازوں میں پہنچ چکا تھا۔ ریٹ ہاؤس میں اس قلائچیں بھرتی شوخ و شنگ ہرنی کو چائے پنی دو بھر ہو گئی تھی کہ وہ فی الفور بازار جا کر اپنے یار دوستوں کو فون کرنا چاہتی تھی۔ چیو پل سے اتالیق بازار کے آخری کونے تک مشی خان مشی خان کی آواز کی بھر پور گونج تھی۔ ساتھ نشلی آنکھوں اور بونے سے قد والی زیب چودھری بھی تھی۔ شاہی بازار کے کارز سنور پر کال پر کال ہو رہی تھی اور پنی باجی کا دل دھڑک دھڑک پڑتا تھا کہ بل معلوم نہیں کتنا آئے گا۔

”ارے آپ چپکی رہیے ادھر ادھر کھسک جائیے کرنے دیں انہیں خود پے منٹ“

میں نے ذرا تسلی دی۔

میں ایک جنرل سنور میں بیٹھی تھی جب اپنی باجی چنگیر میں تنوری نان پر گرم گرم تکے لیے میرے پاس آئیں۔ کیسا ممتا بھرا لہجہ تھا انکا جب وہ بولیں ”لو تم کھاؤ“۔

ہم دونوں جب اُکھیاں توڑ توڑ کر کھا رہی تھیں انہوں نے بتایا تھا پورا اعلیٰ سیخ کبابوں کی دوکان پر کھڑا موج میلے کر رہا ہے دوکاندار کی نگوں کی پرات خالی ہو گئی ہے۔ میں بہت خوش ہوں آخر ان لوگوں کی کمائی کا ذریعہ ہم جیسے لوگ ہی تو ہیں۔

مشی خان کے لیے اُنکا سکو تادل مقامی غریب لوگوں کے لیے کیسا دریا بنا ہوا تھا۔

سچی بات تھی کہ سارے بازار میں تھر تھلی مچی ہوئی تھی۔ اسٹنٹ کمشنر اظفر کی جیب سڑکوں پر دندناتی پھرتی تھی۔ مشی خان اور زیب چودھری سروں پر ہیٹ دھرے جانے کہاں کہاں نجل ہوتی پھر رہی تھیں۔ ڈرامے کا ہیرو ظل عارف لونگ بوٹس اور واسکٹ کی تلاش میں دوکانوں میں کہیں گم تھا۔

ایک بج رہا تھا اور چترال سے نکلنے کی مجھے کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ شاہی قلعہ روڈ کے کونے پر کھڑی میں اس تماشے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ”آج کا دن بھی ضائع ہی ہوا“ کے احساس پر کڑھ رہی تھی۔ چترال کی یہ دوپہر ۳۵ سینٹی گریڈ کے نیچے جل بھن رہی تھی۔ جب پروین گروسری کی دوکان سے نکلی۔ قریب آئی اور بولی۔ پشاور ٹی وی کی آرٹسٹ عفت صدیقی جس نے ڈرامے میں کالا شی بوڑھی عورت کا کردار کرنا تھا ابھی تک نہیں پہنچی۔ ٹیم نے تمہیں یہ کردار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پروین کے ہاتھوں میں سنہری و سرخ پنی سے منڈھی اور کروشیے کی لیس سے جی رنگین ڈنڈی والی پنکھیا ہے جس نے مجھے ہوا دینی شروع کر دی ہے اور حرارت میں ڈوبا میرا وجود یکدم لطیف سی خوشگوار محسوس کرنے لگا ہے۔ اسوقت میں کہیں کسی گھی شکر والی پرات پر بیٹھی ہوتی تو پروین کا منہ میٹھے سے بھر دیتی۔ مجھے نیلی چھت والے پر بے اختیار ہی بہت پیار آیا۔ نیاز مندی اور عاجزی کا گداز پن میرے قلبی محسوسات کو قیق کرنے لگا۔

مدتوں سے دماغ میں اظہار خود نمائی کا ایک کیزا کلبلا تار رہا ہے۔ جو یقین دلاتا تھا کہ اگر گلوکاری کے میدان میں کودو گی تو جھنڈے گاڑ دوں گی۔ اگر اداکاری کرو گی تو کشتوں کے پستے

اگاتی ہوئی شہرت کے چو بارے کی مٹی پر جا بیٹھو گی۔

تو کیا اب

میں نے سر جھٹک دیا تھا۔

## کوہ قاف کی پریاں۔ یونانی لڑکیاں کراکال اور جستھاکن

بچیوں میں سامان کی لد لدائی اور ٹھونسا ٹھونسی بے سلیتگی اور بے ہنگم پن کو نمایاں کرتی تھی۔ پر جو نہی ان پر کاجل سے بھری آنکھیں مٹکاتے اور ادائیں دکھاتے دو وجود بیٹھے سب کچھ جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔

گاڑیاں پشاور روڈ پر تیزی سے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ تقریباً کوئی پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سب سے اگلی گاڑی مین روڈ چھوڑ کر ڈھلانی راستے سے نیچے اترنے لگی۔ ”آ یون آ گیا ہے۔“ ڈرائیور نے کہا میں نے دہنی طرف دیکھا تھا اور ڈرائیور کو گاڑی روک دینے کے لیے کہا۔ نیچے اتر کر سامنے دیکھا۔ سورج کی سنہری چمکیلی چھتھار کے نیچے بلند و بالا سنگلاخ خاکستری پہاڑوں کے دامن میں گہرے سنہرے میں لپٹی وادی نظروں کو خُسن کے نشیلے جام پلانے لگی تھی۔ دریائے چترال اسوقت چاندی کی کسی موٹی لکیر کی مانند آ یون کے گرد نیم دائرہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چوکور اور ٹکونے کھیتوں کے ٹکڑے یوں جان پڑتے تھے جیسے وسیع و عریض قطعہ پر جا بجا سبز قالین بچھے ہوں۔ بلندی سے نشیب کے اس منظر کی دید اسے کچھ زیادہ ہی قاتل بنا رہی تھی۔

معلق پل سے گزرنے کا تجربہ بہت دلچسپ ہے۔ چھن چھن ہوتی ہے جیسے کہیں پازیبیں بجتی ہوں۔ دریا کی ٹھنڈی ہواؤں میں لپٹے جھلار سے ملتے ہیں جیسے جھولے کوماں کا ممتا بھرا ہاتھ جھلاتا ہو۔

معلق پل سے اترتے ہی گھنے سرسبز درختوں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر ایک اور پل آیا جسکے نیچے دریائے کیلاش جھاگ اڑاتا رواں دواں تھا۔ آیون مرکزی وادی ہے۔ کیلاش کی تینوں وادیوں، بموریت، ریمبور اور بریر کو یہیں سے راستے جاتے ہیں۔

گاڑیاں گرد بازار میں شہوت اور اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں تلے جا کر رُک گئیں۔ ساتھ ہی صحن بازار تھا۔ بازار کیا تھا چند دوکانیں تھیں۔ رُکنے کی وجہ عفت صدیقی کے چترال پہنچنے کی اطلاع تھی جسے اے سی صاحب کی ذاتی گاڑی لارہی تھی۔

اور شیخ جی کی کچے انڈوں والی ٹوکری ٹوٹ گئی تھی جسے صرف پندرہ کلومیٹر پر محیط آدھ گھنٹے کی ڈرائیو میں انڈوں سے مرغیوں بھینٹ بکریوں گائے بھینسوں اور زراعتی فارم تک کے جان لیوا مرحلے پل جھپکتے میں سکھ سکون سے طے کر لیے تھے۔

”چلو دفع کرو۔ گولی مارو۔ چولہے میں پھینکو شہرت کو۔ آیون کی سیر کرتے ہیں۔“ میں نے اپنے آپ کی دلداری کی۔

پشاور روڈ پر کھڑے ہو کر وادی کے جس نظارے نے قلب و نظر کو جتنا مسحور کیا تھا وادی کے اندر اتر کر اتنی ہی مایوسی ہوئی۔ گلیاں اور گھر پنجاب کے کسی اُجڑے بجزوے گاؤں جیسے نظر آتے تھے۔ بے ڈھبے سلیقے طریقے اور صفائی ستھرائی سے عاری گھروں کے آنگن۔ پاؤں راستوں میں بکھری دھول مٹی میں اٹ گئے تھے۔ بہر حال میرے نصیب کا جو جو آب و دانہ جس جس گھر میں دھرا تھا وہ سب میں نے سمیٹا۔ کہیں نماز پڑھی کہیں چٹائی بننے دیکھی۔ کہیں کسی نوزائیدہ بچے کے چہرے کو سرونگ (بالوں کی صفائی کے لیے بکری کے جلے سینگوں کا پاؤڈر) میں لت پت دیکھا۔ اور جب گھنٹے بھر کی آوارہ گردی کے بعد آئی۔ پروین کا غصہ ناک پر دھرا تھا۔ پوری بتیسی کھول کر میں نے اسکے غصے کو شہد بھرے چچ کی طرح حلق میں اتار لیا تھا۔

ریت اور مٹی اڑتی تھی۔ راستہ اکثر و بیشتر مقامات پر تنگ اور عمودی تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی کسی حادثے کا فوری سبب ہو سکتی تھی۔ کٹے پھٹے بنجر اور پُرہیت پہاڑ سڑک کی بعض جگہوں

پر ڈراؤ نے جنوں کی طرح دانت نکو سے جیسے آپکو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچنے کے لیے تیار۔  
جہاں چڑھائی کے موڑ آتے اور گاڑی ٹرن لیتی تو عقبی منظروں میں برفانی چوٹیوں کی ننگی وحشت  
بسا اوقات جسم پر لرزہ سا طاری کر دیتی۔ دریائے کالاں کی گہرائیاں کہیں بصارت میں اور کہیں اُس  
سے کوسوں پرے۔

مجھے دکھ ہوا تھا کیلاش کی وادیاں اپنے قدیم تہذیبی ورثے اپنے عقائد و رسوم اپنی  
پراسراریت اپنے انوکھے رنگوں ڈھنگوں اور پُربہارتہواروں سے اندرون اور بیرون ملک سیاحوں  
کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ کیا تھا جو سڑکوں کا ناک نقشہ ذرا ڈھنگ کا ہو جاتا۔

میں نے اب تک کے سفروں میں بالعموم ڈرائیوروں کو از خود ہی گائیڈ کے فرائض  
سنجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا یہ نوجوان سالز کا جسکی پیشہ دارانہ مہارت عمودی  
چڑھائیاں چڑھنے رپورس کرنے اور گاڑی سے بغل گیر ہونے کے لیے بیتاب چٹانوں کے شر سے  
اُسے محفوظ رکھنے میں بلاشبہ بہت مستند تھی سارے راستے جڑوں کو یوں بھینچے بیٹھا تھا جیسے اُسے دندل  
کا دورہ پڑا ہو اور جسکی کھولائی بڑے سے چچ کے بغیر ممکن ہی نہ ہو۔

نیچے چند زیر تعمیر عمارتوں کو دیکھ کر دو بار اگلے بارے میں پوچھا تھا۔ تب کہیں جا کر سنا  
کہ ”آیون کے لئے بجلی گھر زیر تعمیر ہے۔“ دو دریائی نالوں کے ملاپ کے بارے میں جاننے کا  
بھی یہی حال ہوا۔ مجھے تپ چڑھی۔ جھلا کر بولی۔

”گو نلے کا گڑ کھائے بیٹھے ہو۔ بتاتے نہیں۔ کچھ جاننے کے لیے یہاں نجل ہو رہے

ہیں۔“

”نالہ بمبوریت اور نالہ ریمبور۔“ جواب میں بے نیازی سی بے نیازی تھی۔

پھر ایک پل پر کراسنگ ہوئی اور گاڑیاں دو باڑ چیک پوسٹ پر رُک گئیں۔ یہاں  
تھوڑی سی شوٹنگ ہوئی۔ اس چیک پوسٹ کے پہلو سے ایک راستہ دائیں جانب ریمبور اور بائیں  
جانب والا بمبوریت کی طرز جاتا ہے۔

صد شکر کہ یہاں پروانہ راہداری پاکستانیوں کے لیے بیس اور غیر ملکیوں کے لئے پچاس روپے تھا۔ چلو کہیں تو فارنز کے مقابلے میں ان بے چاروں کو بھی عزت و تحریم ملی۔ چیک پوسٹ کا انچارج بڑا خوش و خرم اور چچہا نے والا مرد تھا۔ اسکی چترالی ٹوپی پر لہراتے مرغ زریں کے پر سیاہ لباس گوری رنگت اور ہنستا مسکراتا چہرہ بے رونق پہاڑوں سے گھری اُس اُداس سی شام میں تھوڑی سی رنگینی اور زندگی پیدا کرنے کا موجب تھا۔ انگریزی میں سڑک کے ایک طرف نصب بورڈ پر سیاحوں کے لیے ہدایت نامہ درج تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

جب راستے کی تنگی کشادگی میں بدلنے لگی جب ہرے بھرے کھیتوں درختوں اور شام کی سرد ہواؤں نے استقبال کیا۔ تب اُس لڑکے کی دندل ٹوٹی۔ پتہ نہیں کیسے وہ بولا اور خوب بولا۔ ”بمبوریت تقریباً بارہ گاؤں پر مشتمل کالا ش کی سب سے بڑی وادی ہے۔ چترال سے اس کا فاصلہ کوئی ۳۸ کلومیٹر ہے۔ پہلو واندہ، کندیسار، احمد آباد میں مسلمانوں کی اکثریت جبکہ کراکال، انڈیر برون اور بتریک میں کالاشیوں کی کثرت اور شیخانہ میں مکمل مسلم آبادی ہے۔“

مکئی اور گندم کے کھیت، درختوں کے سلسلے اور مکانات۔ پھر جیسے اس منظر میں سڑک کے کنارے چلتی چند کیلاشی لڑکیاں اُبھریں۔ اُجلی رنگت سیاہ پیرھن اور رنگ رنگیلے موتیوں ہاروں سے مزین۔ گھنیری راتوں میں جیسے چاند چمکے۔

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا جیسے دل کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔ بہت پرے بہت دُور گاؤں میں لائین کی روشنی میں کہانیوں کی کتاب ہاتھ میں تھامے چوتھی جماعت میں پڑھنے والی وہ لڑکی سامنے آ گئی تھی۔ جو پوہ ماگھ کی سرد تاریک راتوں میں پڑھتی تھی۔ بہت دور اونچے اونچے پہاڑوں سے بھی دور دریاؤں اور سمندروں سے بھی پرے ایک مُلک تھا جس کا نام کافرستان تھا وہاں پر یاں رہتی تھیں۔ اور آج بہت دور دریاؤں سے دور پہاڑوں سے دور ایک جگہ کافرستان اس میں رہنے والی پر یاں انکی صورتیں انکے پہناوے انکے زیور۔ میرے بچپن کی ساری فینٹسی جسم ہو کر میرے سامنے تھی۔

سڑک کے ساتھ ساتھ درخت چلتے تھے۔ پس منظر میں کھیت اور پہاڑ چلتے تھے پھر جیسے ہونٹوں کی بارات چلنے لگی۔ بے نظیر، تاج محل، فرنیر، ٹورسٹ، کیلاش، جناح اور لاہور ہونٹ۔ غیر ملکی اور ملکی سیاح کندھوں پر کیمرے لٹکائے بازار میں دوکانوں اور سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ نورستان کے پہاڑوں سے آنے والی ہواؤں نے ململ کی قمیض اور ڈوپٹے میں لپٹے وجود کو ہلکی سی کپکپاہٹ دے کر اُسے سکیڑنے کی کوشش کی تھی۔

اور یہاں سڑک ختم ہوتی تھی۔ وادی ختم ہوتی تھی اور یہیں ایک جیسے پہاڑوں درختوں ندی نالوں اور کھیتوں کھلیانوں میں وہ لائن بھی تھی جسکے آ پار دو ملک بستے تھے۔ اس وادی کے آخری کونے میں وہ ریست ہاؤس تھا جس کے لان میں جانے کب سے اخروٹ کا قدیمی درخت پر پھیلائے کھڑا تھا جس کے نیچے کچھی کرسیوں میں سے ایک پر میں بیٹھی۔ اور سامنے اور پشت کے پہاڑوں سے آنے والی افغانی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے ان جھنجھٹوں اور جھمیلوں کو دیکھنے لگی جس میں پروین عاطف اُبھی ہوئی تھی۔

رات کو ڈرامہ ”دروازہ کھلا رکھنا“ کی شوٹنگ تھی۔ کافرستان کی اصلی پریوں اور نقلی پریوں کی۔ نقلی پریوں کے سیاہ سنگھاش (سیاہ چونے) کو پسی (کوڈیوں والی ٹوپی) نیلے پیلے ہاروں کے بنڈل بیڈوں پر بکھرے پڑے تھے اور تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔

نارج کی روشنی کا چھوٹا سا دائرہ تاریک اور ڈراؤنی رات کے سینے میں کسی تیز اور نوکیلے برے کی مانند سوراخ کرتا اور راستہ دکھاتا جس پر میں ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے رکتے سانس درست کرتے چلتی جاتی تھی۔ پہاڑ کی اس چوٹی پر گھروں کے اوپر چار سو (ڈانس گھر) کی جانب ملکی وغیر ملکی لوگوں کے ساتھ مقامی آبادی کے لوگ بھی رواں دواں تھے۔

اوپر لائینیں جلتی تھیں اور ڈھول بجاتا تھا۔ ویڈیو کیمرے کی روشنیاں سیٹ ہو رہی تھیں۔ اونچے اونچے قہقہے سیٹیاں اور آوازوں کا شور سنانے کو لیر لیر لرتا تھا۔

پھر سین شروع ہوا۔ دو معمر مرد برچھی نما لائینیاں ہاتھوں میں تھامے نظریں جھکائے

دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک اجنبی زبان کا گیت فضا میں بکھرتا ہے۔ صوحو کی آوازوں کا شور مچتا ہے۔ مٹی خان کو اپنے گھیرے میں لیے خواتین چاروں طرف دائرہ بناتی آہستہ آہستہ صوحو کی لمبی ہیکوں کے ساتھ آگے پیچھے ہوتی ہیں۔ گیت ختم ہوتا ہے۔ ڈھول کی دھما دھم اور سیٹیوں میں تیزی آتی ہے۔ رقص بھی تیز ہوتا ہے۔ فلپس کی روشنی میں انکے تروتازہ چہرے سیاہ لبادے رنگین ہاروں کے گچھے ٹوپوں پر مرغ زریں کے پروں کے گچھوں سے بنے پھول سجھی ماحول کو سحر زدہ سا کرتے ہیں۔

یہ گنہگار آنکھیں اب تک رقص کے نام پر جسمانی اعضا پھڑکانے منکانے بے ہنگم اُچھل کود اور جذبات براہیختہ کرنے والی حرکات ہی دیکھتی چلی آئی تھیں۔ اس ٹھنڈے ٹھنڈے سے چل چلاؤ دھیرے دھیرے دھول اُڑاتے آگے پیچھے جاتے پاؤں اور صوحو کی آوازوں والے رقص جس کی چاروں کھونٹ دھوم تھی اور جسے دیکھنے کے لئے دم نکلا جاتا تھا۔ کودیکھ کر قدرے مایوس ہوئی تھی۔ اس کا لاشی لڑکے کی بات دل کو لگتی تھی جس نے نیچے سے آنے والے لڑکوں کی لوفرانہ حرکات پر تیخ پاہو کر کہا تھا۔

”یاد رکھیں یہ ہماری عبادت ہے۔“

نور پیر کے تڑکے آنکھ کھلنا میرا ہمیشہ کا معمول ہے۔ ریٹ ہاؤس میں سارا عالم ابھی سوتا تھا۔ باہر مظاہر فطرت جاگتے اور دل لہکتے تھے۔ نماز کے لئے مسجد بھی نظر آگئی تھی۔ بلند و بالا چوہی ستون اپنے ڈیزائن اور بناوٹ و قامت کے اعتبار سے وادی کی طرح ہی منفرد تھے۔ مرکزی دروازے پر ’زخاک آفریدہ خداوند پاک پس ای بندہ گی کن جونرگ‘ لکھا ہوا تھا۔

نمازی جانے کہاں تھے۔ مسجد میں سناٹا تھا۔ برآمدے کے چوہی ستونوں کا گہرا فیروزی مائل بزرنگ بولتا تھا۔ پتھروں اور شہتیروں سے بنے صحن کے نیچے تہ خانے میں بے تہ کھال پر وضو کے لیے جگہ اور بیت الخلا تھے۔ فرش پر خشک نرم گھاس صفوں کی مانند بکھری پڑی تھی۔ اسی پر

ماٹھا ٹیک دیا۔

میرے اندر دُکھوں کا بھانبر جلتا تھا۔ مجھے فکریں مضطرب رکھتی تھیں۔ اندیشہ ہائے دور دراز چین نہیں لینے دیتے تھے۔ دو قطرے آنسوؤں کے کیا نکلے جیسے میرا منو اس کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہچکیاں تھیں۔ بھل بھل گرتے آنسوؤں کی برسات تھی۔ پروردگار بیٹی پڑھائی سے فارغ ہونے والی ہے اُسکے لیے نیک لائق لڑکا۔ مولا رشتہ چل کر میرے گھر آئے کسی کو کہنے سے مجھے اپنی سبکی محسوس ہوتی ہے۔

کچھ پتہ نہیں کب اس بہاؤ میں کمی آئی۔ بس جب سر اٹھایا تو اشکوں سے بھری آنکھوں نے پہاڑوں کے اوپر سے جھانکتی روشنی کی سنہری کرن کو دیکھا اور وہاں سے نگاہ پلٹی تو سبزے کا دل فریب منظر سامنے تھا۔

کہیں اندر سے یقین و بے یقینی کی کیفیت میں لپٹا سوال ہوا۔ یہ مژدہ قبولیت کی علامت تو نہیں۔ پتہ نہیں میری ذات ہست و نیست کی گھسن گھیر یوں میں کیوں اُلجھی رہتی ہے؟ یہاں وارث شاہ کے اس کلام کی صداقت سے بھی انکاری ہے۔

اک لاه لباس گلوں پھرن اُداس اک تانوں چاہ نت ہار سنگھار دا اے  
اک چُپ چپیتیاں مُراداں پاؤندیاں نے اک سدا پکار دیاں ریندیاں نے  
ٹھیک ہے اُس نواز نے والے کے رنگ نرالے ڈھنگ نرالے پر یہ بھی نہیں کہ سدا  
پکارنے پر تشنہ کام رہو۔ یوں وہ واقعی قبولیت کی گھڑی تھی کہ ایک ماہ بعد مجھے حسب مراد سبھی کچھ ملا  
تھا۔

باہرنگلی مسجد کے دروازے پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ کہنہ سالہ اور نوخیز۔ میری وادی کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش پر وہ رعنا نو جوان یوں کھڑا ہوا جیسے کوئی تابعدار شاگرد اُستاد کے سوال کا فوری جواب دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔

”یہ بمبوریت کی آخری مسلمان وادی شیخانہ ہے۔ چلیے آئیے۔“ کہتے ہوئے

جب اُس نے قدم اٹھائے تو ساتھ ہی گائیڈ کے فرائض بھی سنبھال لیے۔ افغانستان اسکے ساتھ سر سے لے کر پاؤں تک جڑا ہوا ہے۔

نورستان کے پہاڑوں سے اترنے والے نالے کے اٹھکھیلیاں کرتے چاندی جیسے شفاف پانی کو سورج کی ابھرتی کرنوں کی روشنی میں دیکھنا مکئی کے کھیتوں کی وٹوں اور پگڈنڈیوں پر چلنا۔ ندی کے پار کے گھروں سے اٹھتے دھوئیں کی دید۔ فشریز ڈی۔ پارٹمنٹ کی سیر حوضوں اور تالابوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی پیدائش سے بلوغت تک مختلف مراحل کے نظارے سب دلچسپ اور معلوماتی تھے۔

اب مجھے ناشتے کی ضرورت تھی۔ چائے کی طلب تھی۔ درختوں پر لنگتی تازہ خوبانیوں اور شہتوتوں کو میں نے صرف چکھا تھا۔ عبدالرب کو خدا حافظ کہہ کر ریٹ ہاؤس آئی۔ یہاں ڈرامے کی اداکارائیں شوٹنگ کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ مرد لوگ غالباً لوکیشن کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ اور پروین عاطف جانے کہاں تھیں۔

تقریباً تین کلو میٹر کا یہ ڈھلانی راستہ تھا جسے پیدل طے کرتی میں کڑا کال پہنچی تھی۔ وادی کے آغاز سے اختتام تک یہی کچی روڈ ہے۔ جس کی گہرائیوں میں دریائے بمبوریت شور مچاتا گیت گاتا اچھلتا کودتا بہتا ہے۔ سڑک کے اوپر والے پہاڑ کتنے عاجز اور مسکین سے نظر آتے تھے جھکے ہوئے جیسے کرسیں ٹوٹی ہوئی ہوں جیسے آپکو تعظیم دیتے ہوں۔ مکئی کے کھیتوں کا ایک سمندر پھلدار درخت دو منزلہ چوہی گھر جنکی کشادہ کھڑکیوں سے اندر کی سیاہی جھانکتی تھی اور پھر وہ اپسرا میں وہ سیاہ پیرہن پہنے موتیوں سپیوں سے بچی پر یاں کہیں کھیتوں میں بکھری کہیں راستوں میں بچی کہیں بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتی آپکو حیرت زدہ کرتی تھیں۔

پراک اور منظر بھی خاصا حیران کن تھا تقریباً چھ سات غیر ملکی نوجوان لڑکیاں کیلاشی بچوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ بے ڈھب انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی جاتی تھیں جینز کے نیچے موٹے موٹے گورے گورے پاؤں قینچی چپلوں میں پھنسنے سڑک کی دھول مٹی سے اٹے پڑے

تھے۔ پتہ چلا کہ یہ ٹولہ یونان ٹیچرز سوسائٹی کی طرف سے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو ماہ کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔

Thenvis Leronnis, Maria Kokicini, Ourenia, یہ

Lena Kokin اور Helen Ziti تھیں۔

اب میں ان کے ساتھ ہوئی کہ چلو دیکھیں تو سہی یہ سب ہے کیا۔ سکول میں ٹینکی پر ان ننھی منی بچیوں کے ہاتھ ڈھلاتے ہوئے جب ماریا کو لیسینی اور ہیلن زٹی نے کلاشوار (کلاشیوں کی زبان) میں انہیں ہدایات دیتے ہوئے بولنے میں جو تیزی اور رفتار دکھائی۔ میں تو حیرت کی جیسے دلدل میں گر گئی۔ پھر وہ اس ریورز کو ہانکتی ہوئی کلاس میں لے گئیں۔ اب یہ انکی آرٹ کلاس تھی۔

”یہ یونانی ہیں۔ الیگزینڈر دی گریٹ کی فوج کے ان سپاہیوں کی اولاد جو بیماری کے باعث یہاں رہ گئے تھے۔ انکے نقوش میں یونان جھلکتا ہے انکے رسم و رواج یونانی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ گریک گورنمنٹ انکی بہبود کے لیے بہت کوشاں ہے۔“ مجھے ہیلن زٹی نے مطلع کیا۔

ان باہر والوں کی ممتا کتنی پھٹی پڑ رہی ہے ان کے لیے۔ میری سوچ میں کڑواہٹ تھی۔ اب حکومت ان کے زمانوں پرانے کلچر رسم و رواج انکی تہذیب کو مسلمان اور عیسائی مبلغوں سے محفوظ رکھنے میں نہایت سرگرم ہے کہ وادی اس کے لیے سونے کا انڈا ثابت ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ان انوکھے لوگوں کو دیکھنے کے لیے پینڈے مارتے چلے آتے ہیں۔ کچھ تو سامان انکی دید کا ہو۔ پر آگہی کے اس دور میں جب دنیا گلوبل ویج کی شکل اختیار کر گئی ہے اور خود یہ لوگ جو اب تعلیم آرٹ اور علم کے بہاؤ میں بہنے شروع ہو گئے ہیں کب تک نئے رجحانات کے سامنے مدافعت کے بند باندھیں گے۔

ساری دو پہران کے دو منزلہ چوبی گھروں کی دید میں گزری۔ شیرخان نامی لڑکا میرا

رضا کارانہ گائیڈ بن گیا۔ سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہتا ٹھنڈا ٹھار پانی ندی نالوں کے ساتھ ساتھ زینہ در زینہ کھیتوں پھلدار اور سایہ دار درختوں سے گھرے یہ گھر جن کے آنگن دیوار جیسی قیمتی لکڑی کے ڈھیروں سے بھرے پڑے تھے۔ چوبی زینے جن پر سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔

سیاہی سے اٹے ہوئے گھر کہ یوں گمان گزرے جیسے کونکے کی کان میں داخل ہوئے ہوں۔ تختوں پر دھرے ایلومینیم چینی اور لکڑی کے برتن۔ تخت پوش اور کسی گھر میں ایک آدھ کرسی میز بھی۔ بڑے کمرے کے وسط میں آگ جلتی تھی اور چیتان (چاول کے بھس اور رسیوں کی آمیزش سے بنی) چنائیاں نکھی تھیں۔

کہیں تپاک محبت بھری مسکراہٹیں ٹوٹی پھوٹی باتیں۔ کہیں بے اعتنائی بیزاری سبھی جذبوں سے واسطہ پڑا۔

اب میں تھوڑی دیر کہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ ستانے کو دل کرتا تھا۔ اس گرم دوپہر میں فطرت کا خاموشی سے نظارہ کرنا بھی مقصود تھا۔

شیر خان سے معذرت کرتے ہوئے میں ایک کشادہ سے میدان میں اخروٹ کے گھنے درخت تلے پڑے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ میرے آس پاس درختوں نے اپنے پھل یوں زمین پر گرائے ہوئے تھے کہ جیسے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اس زکوٰۃ کو لینے والا کوئی نہیں تھا۔

گندم کٹ کر سمیٹی جا چکی تھی۔ اور اب ہر طرف مکئی کے ہرے کچور پودوں کا راج تھا۔ انکی ہریالی اور گھنیرا پن آنکھوں کو طراوت اور دل کو شادمانی دیتا تھا۔

میں نے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ خاموش پراسرار بھید بھرے پہاڑ جانے کب سے کھڑے تھے۔ وادیوں کی خوشیوں غموں کے بے زبان سنگی۔ انکے رازوں کے امین۔ اس گرم دوپہر میں ان کی طرف مسلسل دیکھنا گویا اپنے آپ کو ایک ہولناکی سے دوچار کرنا تھا کہ وہ تو چپ چاپ آپکو گھورتے چلے جاتے ہیں۔ دید کے ہر لمحے نئی نئی خوفناک صورتوں کا روپ دھارتے

دھیرے دھیرے آپ کی رگ رگ میں خوف سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے کوہساروں سے منہ موڑ کر اُن بچیوں کی طرف توجہ کی جو میرے ارد گرد اکٹھی ہو گئی تھیں۔ پر یہاں ادا میں تھیں اور پیسوں کی طلب۔ میں حسن پرست تو نہیں پر خُسن سے متاثر ضرور ہوتی ہوں۔ اور یہ چہرے متاثر کن تھے۔ اپنے روایتی ملبوسات میں شہابی رنگوں نیلی اور بھوری آنکھوں اور ریلے ہونٹوں کے ساتھ کم عمری اور آگہی کے جدید ذرائع سے دوری کے باوجود حسین بننے والے کچھ لوازمات کی لیدیا پوتی اُن چہروں پر تھی۔

قریبی بہتی کھال کے پانی سے میں نے منہ ہاتھ دھویا اور اُسے پیا۔

اُس پانی میں کیسی خنکی کیسی مٹھاس سی تھی کہ جس نے میرے اندر جا کر ساری حرارت کو جذب کر لیا تھا۔ یہ چھوٹی سی کھال بلند یوں سے آ رہی تھی۔ وادی کے کھیت کھلیان اور لوگ ان کوہساروں کے کس قدر احسان مند تھے کہ جو سرمائی شدتوں کی سوغاتیں اپنے سینوں میں سمیٹ کر انہیں اس موسم میں حیات بخش تحفے کی صورت میں عنایت کرتے تھے۔ ہزاروں فٹ گہرے ندی نالے آبپاشی کے لیے کب موزوں تھے۔

میں نیچے سڑک پر آئی۔ اور ایک نئے منظر سے آشنا ہوئی۔ یہ سڑک سے قدرے ہٹ کر پختہ سرخ اینٹوں کا ایک بند کمرہ تھا جس کے دروازے پر کھڑی چند لڑکیاں ہنستی تھیں۔ دو تین دہنی دیوار کے ساتھ چمکی ہوئی تھیں۔ میرا سارا بچپن چھوٹے چھوٹے دیہاتی ریلوے سٹیشنوں کے ساتھ اسی طرز تعمیر والے کمروں کو دیکھتے گزرا تھا۔ لڑکیاں کھی کھی کرتیں چہرہ چھپاتی اور ادا میں دکھاتی تھیں۔

پھر میرے ہتھے ایک گائینڈ چڑھا۔ جس کے کندھے پر لٹکے تھیلے میں بہت سی نادر چیزیں تھیں۔ پہلا مرحلہ تصویروں کا تھا۔ کالا شی لڑکیوں، قبرستان میں دھرے ٹوٹے پھوٹے تابوتوں میں بکھرے انسانی اعضاء اور کھوپڑیاں، چوب کاری کے اعلیٰ نمونوں والے دو منزلہ گھر۔

”میں نے تو اب تک ایک بھی ایسا گھر نہیں دیکھا۔ تم نے کن کی تصویر کشی کی ہے؟“

میں نے بے اختیار پوچھا۔

”یہی گھر ہیں۔ فرق نئے اور پرانے کا ہے۔“

بہر حال تصویروں کی چھانٹی ہوئی۔ پیسوں کی ادائیگی کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ بٹالینی ہے“ میرے استفسار پر وہ گویا ہوا۔ ”آپ سے لیڈیز نرسنگ ہوم کہہ سکتی ہیں ہمارے مذہبی عقیدے کے مطابق ایام کے دنوں میں عورت ناپاک اور نجس ہوتی ہے وہ گھر میں عام لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ بٹالینی اسی مقصد کے لیے ہے۔ کہ یہاں عورت تکلیف کے ان ایام کو آرام فراغت اور ساتھی خواتین سے گپ شپ لگا کر گزارے۔ نہ پکانے کا جھنجھٹ نہ بھیڑ بکریاں چرانے کی ذمہ داری نہ فصلوں کی گڈائی تلائی اور کٹائی۔ بس موج ہی موج۔ پکا پکایا کھانا گھر والے دروازے پر رکھ جاتے ہیں۔“

عورت بھی میں عمر رسیدہ سی تھی اور موضوع گفتگو بھی نسوانی عالمگیریت کا حامل تھا۔ کوئی ایسا ڈھکا چھپا مسئلہ بھی نہ تھا پھر بھی پیشانی عرق آلود تھی شاید اس لیے کہ ماحول اور معاشرے نے ہمیشہ اسے ایک مخفی رکھنے والا ناپسندیدہ عمل سمجھا اور سمجھایا۔ ایام میں جب بھی تکلیف کے باعث بستر پر لیٹے۔ اباچچا میں سے کسی نے پوچھا ماں نے ترت جواب دیا۔ ”ارے سر میں درد تھا پیٹ میں اچھارہ کی شکایت ہے۔“ بیٹی تھی تو یہی سنا۔ ماں بنی تو یہی کچھ سُنایا۔

”اور جب لڑکی پہلی بار بالغ ہوتی ہے۔ سلسلہ کلام دوبارہ جُوا۔ خاندان کی بزرگ عورتیں لڑکی کی سہیلیاں پھل اور پھولوں کی سنگت میں اُسے بصد عزت و احترام بٹالینی لاتی ہیں۔“

کیسا فراخ دل معاشرہ ہے۔ کہیں کلک ہوا۔ ایک جھماکا سا۔ منظر سامنے تھا۔ ساتویں میں پڑھنے والی گیارہ بازہ سال کی لڑکی دو منزلہ گھر کی چھت پر بنی لیٹرین سے دو دو چھلانگیں مارتی نیچے ڈیوڑھی میں اپنی ماں اور ماسیوں کے پاس آئی تھی۔ اڑی رنگت خوف سے پھٹی آنکھیں کانپتے لرزتے ہاتھوں اور ہونٹوں کے ساتھ۔ ماں نے اپنے سینے پر دو ہنڑ مارا اور روتے ہوئے کہا قسمت

کھوئی۔ سیا پاپے گیا۔ ماسیوں نے صورت حال کو سنبھالا۔ رات گئے تک ماں کا واویلا کرنا اُسے آج بھی یاد تھا۔ کہ حیض کی آمد نے اُسکی بیٹی کے نانے قد کی بڑھوتری پر ٹھپہ لگا دیا تھا۔

پھر جیسے میرے اندر کھد بُدی ہونے لگی۔ اندر جار کر تو دیکھوں۔ پر لڑکا بھی بڑا کائیاں تھا۔ ”وہاں کوئی مقامی عورت نہیں جاسکتی۔ اور آپ کس کھیت کی مولیٰ ہیں۔“

میں نے پلٹ کر اس ایف۔ اے پاس گائیڈ کو دیکھا جو محاوروں کی صورت اپنی علمیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے بچے میں تو دو کنال کے گھر کی چھوٹی سی کیاری کی مولیٰ بھی نہیں اور تم بات کرتے ہو کھیت کی۔ پھر یوں ہوا کہ بٹالینی کے اندر کا اسرار گھسیٹ کر مجھے وہاں لے گیا۔ ادھ کھلے دروازے میں گائیڈ ڈالنے کی دیر تھی کہ چار پانچ خونخوار آنکھیں چیلوں کی طرح مجھ پر جھپٹیں۔ بھاگی۔ ذرا فاصلے پر گائیڈ کی آواز سنائی دی۔ سامنے سے ایک جیپ بھی آتی نظر پڑی۔ غصیلی آواز کچھ ایسی تھی۔ آپ کو بتایا تھا کہ بٹالینی ناپاک ہو جاتی ہے اور ایسی حماقت کرنے والا بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ صد شکر کہ جیپ ڈرامہ یونٹ والوں کی تھی جو دو پہر کا کھانا کھانے ریٹ ہاؤس جا رہے تھے۔ میں اس میں بیٹھی اور اونچے سے بولی۔

”میاں بٹالینی تو پہلے ہی ناپا کیوں سے لپی پتی ہے رہی میں تو مجھے چھوڑو۔“

ریٹ ہاؤس میں دال چاول منتظر تھے۔ اُن سے نپٹ کر ندی پر آئی۔ خیر سے یہاں مشی خان پتھروں پر بیٹھی کپڑے دھونے کا شوق پورا کرتی تھی اور مردانہ عملہ اُسکے ساتھ جھلوں میں مصروف تھا۔

سہ پہر پھر کراکال کی نذر ہوئی۔ کالاشیوں کے گڑھ اس گاؤں کا قبرستان بھی زمانوں پرانا ہے۔ جب کالاشی بہت معصوم تھے مُردے کے ساتھ اس کے زیور کپڑے بھی تابوت میں رکھ کر اُسے سوئپ آتے تھے۔ آیون کے ہوشیار اور چالاک لوگ انہیں اُڑانے میں بڑے طاق۔ اب یہ بھی سیانے ہو گئے ہیں صرف چار پائی کی ہی قربانی دیتے ہیں۔ قبرستان ٹوٹے پھوٹے لمبے لمبے تابوتوں سے انا پڑا تھا ان میں لیٹی ہڈیاں۔ بکھری کھوپڑیاں سال خوردہ چار پائیاں دہشت

پھیلاتی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھ کر میں ایک پل کے لیے بھی خود کو اس تابوت میں ہونے کا تصور تک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بلھے شاہ صوفی شاعر ہی نہ تھا انسانی نفسیات کا مزین شناس بھی تھا تبھی تو بول اٹھا تھا۔

بلھے شاہ اسان مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور

میں بھاگی تھی۔ چوٹی پل کے پار زندگی کی رنگینی حرکت اور خدمت کے جذبے سے لبالب بھری آبشار کے نظارے سے کبھی ہوئی آنکھوں اور احساس کو طراوت دینے کے لیے۔ کراکال وادی کو روشنی یہی آبشار دیتی ہے کہ ۴۰ کلواٹ کا بجلی گھر اسی کے دم قدم سے آباد ہے۔ جستھا کن نیا تعمیر شدہ تھا۔ ستونوں چھت اور دروازوں کی نئی نکور لکڑی کی عبادت گاہ میں پھیلی مخصوص سی باس ستونوں پر گھوڑے کے منہ والے جسموں کی آرائش دیواروں پر بھیڑ بکریوں اور بے معنی سی پینٹ شدہ تصویریں سب مل جمل کر ایک پراسرار سا ماحول پیدا کرتے تھے۔ سرما کے تہواروں کی رقص گاہ بھی یہی ہے۔

مرلی کی دلنواز دھن مجھے کشاں کشاں اخروٹ کے اُس درخت کے پاس لے گئی جس کے نیچے بڑے سے پتھر پر بیٹھی سولہ سترہ سن کی وہ ملقا بانسری بجا رہی تھی۔ اسکی نیلی کچور آنکھیں ہنستی تھیں۔ دور کھیتوں میں دو عورتیں چارہ کاٹی تھیں۔ فضا پر بکھرے سناٹے کوندی کا شور اور بانسری کی تان توڑتی تھی۔ میرا گائیڈ بھی مجھے کھوجتا نہیں آ گیا۔ گیت کے بارے میں استفسار پر وہ بولا۔

”یہ جو گارہی ہے بہار کا گیت ہے۔ بہار کا وقت ہے گل و بلبل کا موسم ہے۔ اے میرے پھول تو میری طرف آ جاتا کہ میرا دماغ بھی تیری خوشبو سے معطر ہو جائے۔“

”چلو کچھ کالاں کی تمدنی زندگی پر بات ہو جائے۔“

”اس معاشرے میں مرد کو اونچا مقام حاصل ہے کالاشی عورت بہت کمتر سمجھی جاتی

ہے۔“

”لومرد تو قدیم و جدید ہر سوسائٹی ہر معاشرے ہر تہذیب میں ہمیشہ ٹلے پر چڑھا رہا۔  
بیچاری عورت زمانوں سے بیچ رہی۔ نیچے کے معاشرے میں آج بھی پاؤں کی جوتی ہے جب چاہا  
پہنی جب چاہا اتار پھینکی۔“

”نر جانور کا گوشت اُسے منع ہے۔“

”بھئی یہ نر کی تخصیص کیوں؟ ویسے گوشت تو اب ڈاکٹروں نے خوراک سے منہا کرنا شروع کر دیا  
ہے۔“

”ہاں کالا شی مرد عورت پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اُسے لعن طعن نہیں کرتا۔“

”یہ ہوئی نہ قابل تعریف بات۔ میں ہنسی۔ ارے میاں نیچے تو اچھی بھلی پڑھی لکھی

کمانی کھاتی عورت روئی کی طرح دھنک دی جاتی ہے۔ ذرا سی بات پر گھر سے نکل جانے کی

دھمکی۔ جہیز نہ لانے پر جلانے کی وارداتیں۔ بیچاری بڑی مظلوم ہے۔“

لڑکا بولے چلا جا رہا تھا۔ میری ناگلوں میں اینٹھن تھی۔ چائے کی طلب تھی۔ سامنے

والے پہاڑوں پر دھوپ کے رنگ سبزے کی آمیزش کے ساتھ اتنے بھلے لگتے تھے کہ انہیں

خاموشی سے ایک ٹک دیکھنا بھی نہایت دلچسپ تھا۔

اور جب میں ریٹ ہاؤس میں چائے پیتی اور اپنے آپ سے کہتی تھی کہ۔ اگر مجھے کسی

مقامی فیملی کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔

اجنبی جگہوں پر دعائیں کتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں۔



## شنگھائے۔ بیشا کے پھول

### شیشاؤک ٹوالی اور دکن

ریسٹ ہاؤس کے لان میں چند مقامی لوگ داخل ہوئے۔ یہ مٹی خان کے ساتھ تصویریں اتروانے کے خواہشمند تھے۔ مڈ بھیڑ میرے ساتھ ہی ہوئی۔ میں مٹی خان کو باہر لے آئی یوں ایک چھوڑی تصویریں بن گئیں۔ عورتیں نہال ہو گئیں۔ میرے مسئلے کا جاننے پر فی الفور انہوں نے اپنے گھر کی پیشکش کر دی۔ سفر وسیلہ ظفر یونہی تو نہیں کہا گیا۔ چلیے میں پروین کو خدا حافظ کہہ کر ان کے ساتھ گاڑی میں لد گئی۔

یوں میں بتریک گاؤں کے اس مسلمان گھرانے کی مہمان ہوئی جسکی عورتیں اور مرد اردو سے خاصی شناسائی رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے تھے ہونٹ چلاتے اور سرکاری ملازمتیں کرتے تھے۔ پھولوں پھلوں سبزیوں درختوں پودوں اور سبزے سے سبجے اس گھر میں چائے پلانے کے فوراً بعد ہی وہ مجھے آتلخ خان جو بتریک وادی کی سرکردہ شخصیت ہیں کے گھر چھوڑ آئیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ رات کا کھانا انکے ساتھ کھانا ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صاحب خانہ کے ساتھ اسکا خاندان بھی موجود تھا۔ وادی میں داخلے کے وقت سے میں ایک بڑے سے سوال کی گرفت میں تھی۔ کیسے اور کس طرح اس بے حد قدیم قوم نے وقت اور زمانے کی آندھیوں اور طوفانوں سے قبائل اور قوموں کی یلغاروں سے اپنے ارد گرد موجود مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگوں سے ارتباط کے باوجود اپنے عقائد رسم و رواج اور طور طریقوں کو ہمینہ ویسے ہی سنبھالے

رکھا۔ ان کے ساتھ بہت سے سوالیہ نشان ہیں اُنکے جواب کیا ہیں؟

اپنے آغاز کے بارے میں وہ یوں گویا ہوئے۔ ”ہمارے بارے میں بے شمار آرائیں ہیں۔ چند زیادہ مستند ہیں۔ ”جینیسی“ نے ہماری اصل دراوڑ کی اُس شاخ سے جوڑی ہے جو ابتدا میں مہاندیو کے ماننے والے چینی تھے۔ ہماری مرن جیون کی رسومات قدیم اسرائیلیوں سے بھی ملتی ہیں۔ چند مصنفوں نے مغربی افریقہ کی ایک قوم ”چوس“ سے ہمارا ناطہ جوڑا ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ہمارے جد امجد یونانی تھے جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے۔ چند جرموں نے ہمیں آریاؤں کی اولاد بھی ثابت کیا ہے۔ کلاشیوں کی اکثریت اپنے آپ کو سیام (تھائی لینڈ) سے وابستہ کرتی ہے کیونکہ ہمارے مذہبی گیتوں میں سیام کا ذکر ملتا ہے۔

جب بارشیں رکنے کا نام نہ لیں تب ہماری عورتیں گیت گاتی ہیں کہ اے خدا تو ہم سے

بمبوریت لے لے اور ہمارا سیام ہمیں لوٹا دے۔

بعض یورپی سیاحوں نے بھی اسکی تصدیق کی ہے کہ ہماری جیسی اقدار والے چند قبائل تھائی لینڈ میں رہتے ہیں۔ البتہ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم افغانستان کے علاقے کافرستان سے ہیں جسے اب نورستان کہا جاتا ہے۔ وہاں کے کافرلال اور ہم کالے ہیں۔ چند محقق ہمیں چترال کے باشندے ثابت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی نسل کو بیرونی اثرات سے بچائے رکھا ہے۔ مگر اب مشنریاں ہمیں عیسائی اور مولوی ہمیں مسلمان بنانے پر کمر بستہ ہیں۔ خود ہمارے نوجوان ایک طرف اگر سیاحوں سے الرجک ہیں تو دوسری طرف اپنی اقدار سے بھی کسی حد تک گریز پاتے ہیں۔ وہ جو نئی رُ کے مجھے بولنے کا موقع مل گیا۔

”بھئی جب آپکے بچوں کو ایٹی کیٹس سکھانے کے لیے ٹیچرز یونان سے آئیں۔

وادی میں سترہ سکول کھلے ہوں جس میں پہلی جماعت سے انگریزی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی

جاتی ہو۔ وادی میں پوری دنیا سے سیاحوں کی بھرمار ہو۔ آپکے ہر گھر میں ریڈیو اور ٹرانسٹر بجیں۔

اب ایسے میں آپ خود سوچیے۔ بشائنی میں خاتون خانہ کو بھیج کر آپ اُسے ایک ہفتے کے لیے گھریلو

دھارے سے الگ کر دیتے ہیں۔ زچگی بھی وہ بیس دن تک بٹالنی میں خاندان سے الگ ہو کر گزارتی ہے اناڑی دائی کے ہاتھوں مر جائے تو منحوس ٹھہرتی ہے مردوں کے لیے اسکے جنازے کو کندھا دینا ممنوع۔ اب ایسے میں جو تہذیبی انقلاب آچکے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اس سے خوف زدگی کیسی۔“

تھال میں خوبانیاں اور توت سجے تھے۔ اخروٹ کی گریوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ سیاہی سے اٹے کرے میں مندے پر بیٹھی کوڑیوں سپیوں اور بکری کے سینگوں کی راکھ کے تلوں سے بچی عورت چپ چاپ ہماری گفتگو سنتی تھی۔ بہو نے لوبیا پکایا تھا توے پر پتلے آٹے کو پوڑے کے انداز میں ڈال ڈال کر روٹیاں بناتی تھی۔

پھر جب رات کا چڑھاؤ ہوا۔ تب کچھ لوگ مجھے لینے آئے۔ جن کا آنا مجھے اچھا لگا۔ زارولی خان کے ہاتھ میں لائین اور نشرف بی بی اور بی بی تاج نے نارچس پکڑی ہوئی تھیں۔ رات کی سیاہی خوفناک تھی۔ پہاڑوں سے ڈر لگتا تھا۔ درختوں کو دیکھ کر سارا شریر لرزہ بر اندام تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر لائین کی مدھم اور نارچ کے گول دائرے کی روشنی بڑی مہربان سی لگتی تھی۔ زارولی خان کی آواز سنائی دی کسی جگہ کی طرف اسکے ہاتھ اشارہ کرتے دکھائی دیئے۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں موسم بہار کے تہوار چلم جوشی کے رقص ہوتے ہیں۔“ میں نے راستے سے نظریں اٹھا کر اشارے کی سمت ضرور دیکھا۔ پر تاریکی میں دیکھنے سے بھلا تفصیلات کیا دکھتیں۔ گاڑھے اندھیرے میں ہر چیز تو بھوت پریتوں کے ہیولے بن کر سامنے آتی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کا زور شور سے چلنا اور چشموں کا گونج سے بہنا سبھی جسم و جان پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری کرتے تھے۔

جس کرے میں کھانا چنا ہوا تھا۔ وہ چھوٹا ضرور تھا پر بڑا صاف ستھرا تھا۔ لائین کی روشنی گودھمی سی تھی پر اس دھیماد میں بھی ایک رومانوی منج تھا۔ یا شاید مجھے محسوس ہوا تھا۔ کھانا سادہ مگر ذائقہ دار تھا۔ ابلے چاول گوشت اور سلاد۔ کھانے پر دو موضوع زیادہ زیر بحث رہے۔ پہلا اس

گھرانہ کا چترال کی کٹور فیملی سے تعلق جو تیمور لنگ کی اولاد ہے۔ اور دوسرے وادی میں سیاحوں کی آمد سے مسائل کا پیدا ہونا۔ جن میں ہونٹوں کی کثرت سے تعمیر اور انکی تعمیر میں بنیادی اصولوں کا فقدان جن میں سپنک ٹینک کا نہ بننا سرفہرست ہے جنگلات کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ جس پیمانے پر ان کی کٹائی ہے پیدائش نہیں۔ اب زار ولی خان اور شکور ولی خان جو خود فرنیئر ہوٹل چلاتے ہیں اور دعویٰ دہا رہے ہیں کہ انہوں نے تعمیر میں بنیادی اصولوں کا خیال رکھا ہے۔

شب ب سری جہاں اور جس کے ساتھ ہوئی وہ بھی خوب تھی۔ میل خوردہ مندے پر میں اور وہ ساتھ ساتھ لیٹیں۔ پھر میرا جی کسی چھوٹے بچے کی طرح ہمک کر اسکے سینے سے چمٹ جانے کو چاہا کہ مجھے لگا تھا ماں جی اوپر سے اس وادی میں مجھے اپنی صورت دکھانے آگئی ہیں۔ نیند اور جاگ کی لگن مینی ساری رات چلی کہ کمرے کی سیلن نے نہایت شوخ و شنگ قسم کے کھٹل پال رکھے تھے جو کسی ستم گر کی طرح چٹکی کاٹتے اور غائب ہو جاتے۔ اب نیند کا جالاتنی آنکھوں سے زخم خوردہ حصوں کو سہلاتے ہوئے انکو ادھر ادھر کھوج کرتے کہ مل جائیں تو بھرتہ بنائیں۔ مندے پر ایک چھوڑ کنیوں کو طمطراق سے چلتے پھرتے دیکھ کر تذبذب میں کہ کسے ماریں اور کسے چھوڑیں والی کیفیت۔ دوسری جانب اگر ان سے یاری تھی تو بڑھاپے کی عنایت کردہ نوازشات نے جا بجا دردوں کی صورت نیند عذاب کر رکھی تھی کہ ہاتھ کبھی ٹانگوں کی جانب اٹھتے اور کبھی شانوں کی۔ فجر کی نماز ہم دونوں نے اکٹھی پڑھی۔ پھر میں نے انہیں دبایا۔ ٹانگوں سے لے کر بازو شانے کمر۔ جی بھر کر دبا چکنے کے بعد جو نہی سیدھی ہوئی میرے گلے میں بوڑھے بازو نے ہاتھ ڈال کر میری پیشانی کو قریب لا کر اس پر بوسہ دیا۔ سالہا سال گزر جانے پر آج بھی اُس بو سے میں چٹھی شفقت اور محبت کی یاد میری آنکھیں نم کر دیتی ہے۔

اور جب میں باہر جانے کے لیے جو تا پہن رہی تھی زار ولی خان چائے کی چھوٹی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ”ارے میں جیسے مسرت کی پھوار میں نہا سی گئی۔ گھر سے باہر گھر جیسی پیشانی دیتے ہو جیتے رہو۔“ میں نے اُس چائے کو خنکی سے لبریز اُس صبح کو چسکیاں لیتے ہوئے

یونہی پیا تھا جیسے واڈ کا، شیمپین یا وسکی کا ایک شوقین ڈرنکر اپنی من پسند ڈرنک کو اسکے جلد ختم ہو جانے کے خوف سے دھیرے دھیرے چھوٹی چھوٹی چسکیوں میں پیئے۔

وادی بتریک کے پون فرلانگ پر محیط اس ڈھلانی میدان میں ولی خان سے میں سنتی تھی۔ موسم بہار کے چلم جوشی تہوار کا کٹھ بہیں ہوتا ہے۔

سردیوں کے طویل بیزار کن اور کمروں میں بند دنوں کے بعد ڈھول کی دھما دھم کے ساتھ ڈھولچی کی شنکھائے رسم ادا کرنے کے لیے پکارا گیا حیات نو کے لیے ایک آواز ہے۔ وادی انگریزی لیتی ہے۔ مردوزن جنگلوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بیٹا کے زرد پھول اور اخروٹ کی سبز شاخیں لانے کے لیے پر اس احتیاط کے ساتھ کہ عورت پھولوں کو نہیں چھوتی اور مرد سبز شاخوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ پھر ان سے گھروں مویشی خانوں عبادت گاہوں اور گلیوں دوکانوں کے چہرے مہرے تھے ہیں۔

اور شب کے دوسرے پہر گھر کے کسی چھوٹے بچے کو نہلا ڈھلا کر پیالی میں بکری کے دودھ کا اسکی دو انگلیوں سے پھولوں اور شاخوں پر چھڑکاؤ کر کے گویا گھر سے جنوں کو دلیس نکالا دے دیتے ہیں۔ گھی دودھ اور پنیر سے برتن بھرتے ہیں۔ پرانی شرابیں نکلتی ہیں۔ تب ایک اور دن طلوع ہوتا ہے "شیشاؤک" گاؤں بھر کی نو جوان لڑکیاں نئے لباس حسن کی آرائشی اشیاء لیے ندی کنارے ایک لمبی قطار کی صورت میں تن پر جمی مہینوں کی میل پانیوں کو سو پتے ہوئے نئی سج دھج کے ساتھ گھنگھرد بجاتی دھرتی کے سینے پر غرور اور تمکنت سے چلتی واپس آتی ہیں۔ وادی پھولوں اور پھلوں کی خوشبو میں مہکتی اور سورج کی کرنوں میں مسکراتی ہے اور یہ منظر دیکھتی ہے کہ کالا شی عورتوں کے جتھے توے پراتیں آٹے کی تھیلیاں اور خشک ایندھن پکڑے اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں میں چپاتیاں پکاتی اور گھروں میں تقسیم کرتی ہیں کہ اس صدقے کے طفیل ان کے بچے اور مویشی خنک ہواؤں اور اخروٹ کی ٹوٹی شاخوں سے پناہ میں رہیں۔

وہ صبح بڑی نشاط انگیز ہوتی ہے جب ڈھول بجتا ہے۔ معمر لوگ لٹھیاں ہاتھوں میں

اٹھائے کانوں میں اخروٹ کی سبز ٹہنیاں اڑ سے ناچتے گاتے تعاقب میں جوان لڑکیاں اور انکے عقب میں بوڑھی عورتیں رقص کرتے چلتے آتے ہیں۔ ایک وادی سے دوسری تیسری اور پھر رنگوں کی برسات میں نہایا یہ قافلہ بتریک کی اسی جگہ آڑکتا ہے۔ یہ دن سیٹیوں اور ڈھول کی آوازوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے مخلوط رقص سگریٹ اور مے نوشی اچھے کھانے اور دل پسند مردوں کے ساتھ فرار باہر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کی تفسیر بن جاتے ہیں۔

دھوپ نے میدان میں جس سرعت سے پاؤں پیارے تھے اُس نے گفتگو میں میرے صدر جہاں انہماک کے باوجود مجھے چونکا سادیا۔ میں نے ولی خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جناح اور بہرام شاہ سے مجھے ملنا ہے۔ تم بتاؤ ان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔

برون میں جناح کا ہوٹل ہے اور بہرام شاہ پہلو واندہ میں رہتے ہیں۔ چلیے اب ناشتہ کریں۔ پھر برون چلیں گے۔ ایک کلومیٹر کا تو فاصلہ ہے۔ ناشتے میں شہد کے ساتھ اخروٹ کی گری کے آمیزے سے بنائی ہوئی روٹی تھی اور انڈے کا آملٹ تھا جسے کھاتے ہوئے یقیناً لطف آیا تھا۔ شہد تازہ تھا گھر کا تھا۔ جس کمرے میں اس وقت ہماری نشست تھی اسکی بیرونی دیوار کے ساتھ لکڑی کے بڑے سے جالیدار بکس میں شہد کی کھیاں شہد بنانے میں تن دہی سے مصروف تھیں۔ یہ گھریلو صنعت کالاش کی تینوں وادیوں میں بہت عروج پر ہے۔ لیکن کالاشی عورت کے لیے اسکا چکھنا حتیٰ کہ چھونا تک مذہبی نگاہ سے ممنوع ہے۔ کیونکہ انکے عقیدے کے مطابق عورت نجس ہے اسکے کھانے کی صورت میں اُس گھر سے شہد مفقود ہو جاتا ہے۔ مرغی اور انڈہ دونوں کو کالاشیوں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ اس عقیدے کے بارے میں دو آرائیں ہیں۔

پہلی خدانے باقی جانوروں کے مقابلے میں اسے اڑنے کی صلاحیت سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ گندی مندی چیزیں کھاتی ہے۔ دوسری وجہ زمانوں پہلے کالاش کے ایک مذہبی رہنما کی چترال کے ایک بااثر آدمی سے دشمنی ہو گئی۔ چترالی اُسے جان سے مارنے کے لیے کالاش آیا۔ گھر نہیں پہچانتا تھا مگر اس بد ذات مرغ نے بانگ دے کر گھر کی نشان دہی کر دی۔ یوں مذہبی رہنما

قتل ہو گیا۔ تب سے دونوں چیزیں حرام ہوئیں۔ پر نئی نسل دونوں چیزیں چھپ چھپا کر کھاتی ہے اور مزے اڑاتی ہے۔

دو منزلہ جناح ہوٹل سبزے میں گھرا کالا ش کی قدیم تہذیب کے بہت سے رنگوں کی نمائش کرتا تھا۔ جناح تو نہیں ملاہاں زوئے سے ملاقات ہوئی۔ این۔ سی۔ اے کا گریجویٹ سمن آباد کارہائشی جو آیا تو یہاں آرٹ اور کلچر کی سٹڈی کے لیے تھا پر جانے کیسے اس جادو نگری کا حصہ بن گیا۔ اور اب جشن پوڑ میں کالا ش دو شیزہ کو اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اور جب میں قربان گاہ جانے کے لیے چڑھائیاں چڑھتی اور ہانپتی کانپتی تھی اور یہ سوچتی تھی کہ انسان نے خود کو کائنات کی گنجیل گھیریوں میں کیسے الجھا رکھا ہے۔ عقائد کی جھوٹی سچی رسموں کے گرد ساری زندگی کو پے چڑھائے کولہو کے نیل کی طرح چک پھیریاں لیتا رہتا ہے۔ اور ایک دن دھڑام سے گر جاتا ہے۔ مجھے گائیڈ کرنے والا لڑکا بتاتا تھا۔ کالا ش چار دیو تاؤں کو مانتے ہیں۔ مہاندیو، ورن، پرابہ اور گریمیں۔

”اب انکے کام بتانا مت شروع کر دینا۔“ میں نے رُک کر درختوں کے جھنڈ تلے سستاتے ہوئے کہا۔

”آپ جانتی ہیں۔“ نور علی نے پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا۔ حیاتی کے سارے کاموں کے سلجھاؤ کی پنڈیس کالا شیوں نے ان کے

موندھوں پر تور کھدی ہیں۔ ارے کالا شیوں پر ہی کیا دنیا بھر کے لوگوں کا یہی چلن ہے۔“

برون گاؤں بہت نیچے نظر آتا تھا۔ جنگل بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں مالوش (قربان گاہ)

کس قدر خوفناک سناٹے میں سانس لیتا تھا۔ چوبی پھانک کھول کر میں اندر داخل ہوئی۔ خوف کی

لہریں میرے رُگ و پے میں دوڑنے لگیں۔ چوبی تختوں پر بے شمار الٹی سیدھی لکیریں اور شکلیں

تھیں۔ قدرتی پتھروں کے سائے میں چار چوبی گھوڑوں کے سروں والے بت کھڑے تھے۔ ایک

طرف آگ کی راکھ تھی اور انکے سروں کے نیچے تختوں پر خون کے چھینٹے تھے جو خوف زدہ کرتے

تھے۔

نورشاہ قربان گاہ میں خاموش کھڑا تھا۔

کسی زمانے میں کالاںش میں گھوڑوں کی حکمرانی تھی۔ اسی لیے گھوڑے کو دیوتا کا درجہ دیا گیا ہے۔ عبادت گاہیں بھی ان کے سروں سے ہی جتی ہیں۔

برون سے پہلو واندہ جانا اور بہرام شاہ سے ملنا دونوں کام حد درجہ سہولت اور آنا فانا ہو گئے تھے۔ بہرام شاہ کالاںش قوم کا سرکردہ رہنما سیلانی آدمی جس کا گھر ملنا خاصا مشکل اس وقت وادی بریر کے ایک نوجوان کے ساتھ موجود تھا۔ درمیانی عمر کا بہرام شاہ جس کی تانبے جیسی رنگت میں اس کے چکنے رخسار صحت کی لالی سے دکتے تھے خلوص اور محبت سے ملا۔ گھر کے اندر بیٹھے جہاں اُن کی بیوی کیلاڑ پکاتی تھی (دودھ پنیر اور میدے کے آمیزے کی روٹی)۔ بات چیت شروع ہوئی تو دونوں نے اس پر شدید رنج کا اظہار کیا کہ چترالی انہیں پرکاہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔ انہیں کافر ملعون اور انتہائی ناپسندیدہ قوم گردانتے ہیں۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

کبھی اُن سے بھی تو پوچھیں جو شاکی ہیں کہ پانچ چھ ہزار کی آبادی نے پورا چترال بریغمال بنایا ہوا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے صرف ان تین وادیوں کو فوکس کیا ہوا ہے۔ چترال کی اپنی پہچان اپنی شناخت پس منظر میں ہے۔ گلے شکوے چھوڑیں ملک کے جس حصے میں بھی چلے جائیں یہی رنڈی رونے ہیں۔

تواضع کے لیے جو کچھ سامنے آیا تھا اس میں کیلاڑ نے کچھ اتنی لذت نہ دی شاید وہ بن اسکے ذائقے سے نا آشنا تھا۔ تازہ خوبانیوں خشک توت اور گرم گرم چائے کے کپ نے مزہ دیا۔ اور جب وہ دونوں چٹکی بھرنسوار اپنے گالوں میں رکھتے تھے میں اُن سے سوال کرتی تھی۔

ڈنڈی نہیں چلے گی ٹھیک ٹھیک بتانا ہوگا۔ کتابی اور شخصی مطالعہ نے ایک سوال کھڑا کر دیا ہے کہ چلم جوشی (مئی کے وسط) مرچ وکی نٹ (جون کا پہلا ہفتہ) پوڑ (ستمبر کا آخری ہفتہ) اور

چاؤمس (۲۰ دسمبر) کے تہواروں کے لیے آخرتاریک راتوں کا انتخاب کیا گیا جاتا ہے۔ کیا چاندنی راتوں سے کالاشیوں کی کوئی ناراضگی ہے؟

دونوں ہنسی۔ جو ابشارہ خان نے دیا جو حقیقت پسندی اور صاف گوئی کا مظہر تھا۔

دو باتیں ہیں۔ پہلی کالاشی رومان پسند اور عیش پسند لوگ ہیں۔ لڑکی کو بھگالے جانا دراصل شادی کا ایک طریق کار ہے۔ اس میں جدت اور رنگ آمیزی کرنا اس عمل کو مزید رومان پرور اور دلکش بنانے کے لیے ہے۔ رات کی تاریکی پہلی اہم ضرورت ہے۔ فرار کنواری اور بغیر بچے والی شادی شدہ عورت ہر دو کا ہوتا ہے۔ والدین اور شوہر کا صورت حال جان کر تعاقب بھی ضروری ہے۔ لڑکا مکمل رازداری برتتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ منصوبہ بندی۔ ٹارچوں کی فراہمی۔ جائے مقام کا تعین اور وقت طے کرتا ہے۔

بالعموم جب رقص اپنے جو بن پر ہو۔ جوڑا اپنے عزیز رشتہ داروں کو ڈانچ دیتا ہوا فرار ہوتا ہے مختلف سمتوں میں متعین ساتھی روشنی دکھا کر حالات کے تسلی بخش یا صورت حال کے مخدوش ہونے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر روشنی صرف ایک بار ہو تو مطلب ہے اوکے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر اشارے دو ہوں تو پھر گڑبڑ والی بات ہے۔ اور تین اشاروں کا مطلب حالات کی سنگینی ہے۔ ایسے میں بالعموم وفادار ساتھی لڑکی کو کہیں چھپا کر دوست کو ادھر ادھر کر لیتے ہیں۔ شب کے آخری پہر لڑکی کو لڑکے کے گھر لے جایا جاتا ہے جہاں اگلے چند دنوں میں لڑکی کے والدین یا شوہر اسے واپسی کی ترغیب دیتے ہیں مگر آخری فیصلہ صرف لڑکی کے پاس محفوظ ہے۔ دوسری وجہ لڑکیوں کا آزادانہ سگریٹ چرس اور مے نوشی کا استعمال ہے۔ شب کی تاریکی میں ہر کام کھلم کھلا ہوتا ہے۔

تقریباً دس دنوں پر پھیلے چاؤمس کی تفصیلات لمبی چوڑی بھی تھیں اور دلچسپ بھی۔ لڑکے لڑکیوں کا آگ کے گرد رقص آلاؤ کے شعلوں کی بلندی کا مقابلہ اور پھر جیتنے والوں کا ہارنے والوں کو لعن طعن۔ گوبر کی راکھ گھروں چھتوں اور مویشی خانوں میں بکھیر کر بدروحوں کو

بھگانا۔ گھروں اور جسموں کی صفائی۔ عبادت گھروں میں ڈھول کی دھیمی دھیمی تھاپ اور دھیمے دھیمے رقص کے ساتھ دیواروں پر برش اور سیاہی سے تصاویر بنانا۔ سرگوشیوں میں باتیں کرنا اگلی صبح شور و غل مچا کر عبادت گاہوں میں پینٹ کیے جانوروں کو بھگانا مردوں کی روحوں کو کھانے کے لیے بلانا اور اپنی اپنی دل پسند لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ رقص کرنا۔ گھر کے بڑے بیٹے کا مویشی خانے کی چھت پر بیٹھ کر ہر فرد کے لئے اخروٹ اور نمک کے آمیزے والی پانچ پانچ روٹیاں پکانا اور تقسیم کرنا۔

آگے چلو۔ کچھ اور بتاؤ۔ میں دلچسپی سے پوری طرح اسکی طرف متوجہ تھی۔

کالاشی لوگ رومان پسند ہیں۔ اساطیری دیوی کی طرح ان کی جان رقص و موسیقی کے طوطے میں ہے۔ اپنے دیوتاؤں کو منانے محبوب کو جھانے لہانے نئی زندگی کو خوش آمدید کہنے اور دنیا سے رخصتی کے سہ انہیں رقص کرنا ہے ڈھول کی ڈھم ڈھم اور بانسری کی تانوں میں ان کے سانس چلتے ہیں۔ انکے رقص کے نرت بھاؤ اور موسیقی کی تانوں کی مماثلت کسی قوم کے ثقافتی ورثے سے میل کھاتی ہے یا نہیں۔ میں لاعلم ہوں۔ ہر کالاشی مرد عورت محبت کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ شادی کے لیے سات نسلی پیڑھیوں کی دوری ضروری ہے۔

”یہ تو ڈاکٹروں والا پوائنٹ ہے۔“ میں نے خود سے کہا اور پھر اسکی طرف دیکھا۔

والدین کی طرف سے ارتج کردہ شادی کی نسبت ٹوالی اپنی دلکشی اور رنگینی کے باعث

زیادہ ہر دل عزیز ہے۔

”ٹوالی؟“ میں نے حیرت سے اپنی آنکھوں پر بھنویں اتارتے ہوئے لڑکے کو

گھورا۔

”محبت کرنے والے مرد اپنی محبوباؤں کو بھگالے جاتے ہیں۔“

میراجی چاہا تھا میں کسی نوخیز چلبلی لڑکی کی طرح زور سے سیٹیاں بجا کر ”واؤ“

کہوں۔ پر ”بوڑھے منہ مہا سے کرنے چلے تماشے“ والی پھبتی میں اپنے اوپر کسوا نہیں چاہتی تھی۔

دل مسوس کر رہ گئی۔ نیچے والوں کی ہولناکیوں کا تصور ہی حد درجہ لرزہ برانداز تھا۔ بد بخت اگر کسی سے دل لگا کر چلی گئی تو پاتال کی تہوں سے نکال کر ٹوٹے ٹوٹے کر دی جاتی ہے۔

اور لڑکا اس وقت کسی داستان گو کا روپ دھارے بولتا تھا۔ چاؤ موس (سردیوں کا تہوار) کی برفانی راتوں میں اور جوشی (بہار کا تہوار) کے پُر بہار رُتوں میں جب ان کے پال اور جسم جڑی بوٹیوں کے پانیوں سے غسل کے بعد چمکتے ہیں۔ جب انکے نئے نئے کور لبادوں میں گھنگھر بولتے ہیں جب انکے چہرے آرائشی چیزوں سے گلنار ہوتے ہیں جب جوانوں کے لیے مخصوص کردہ دنوں میں وہ باہم رقص کرتے اور گیت گاتے ہیں۔ تب وہ اپنی دلپسند لڑکیوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔

خوب کس قدر دل خوش کن تصور اتنی نظارہ سامنے تھا۔ محظوظ ہوتے ہوئے میں نے پھر اسے دیکھا۔

”اگر کوئی شادی شدہ بغیر بچے والی عورت کسی دوسرے مرد کو پسند کر لے تو اسکے ساتھ جانے کی صورت میں سابقہ شوہر کے لیے دکن کی ادائیگی ضروری ہے۔“

”دکن؟“ لفظ میرے ہونٹوں پر ابھرا۔ اور آنکھوں میں استفسار پیدا ہوا۔

کالاش معاشرے کا ایک اہم قانون جس کی رُو سے پہلے شوہر کو اسکی دلجوئی کی خاطر اسکا اپنی شادی پر خرچ کردہ مال کا دو گنا دینا ضروری ہے۔ دکن کی ادائیگی کیے بغیر اغوا کرنے والا مرد اپنی محبوبہ کو چھو نہیں سکتا۔ بے شک وہ اسکے گھر میں ہو اور دکن کا تصفیہ ہونے میں مہینے لگ جائیں۔ بس پھر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ لڑائی نہ جھگڑا۔

”چلو باغبان خوش رہے راضی رہے صیاد بھی“ والی صورت حال ہے نا۔

ازدواجی بندھن میں باندھنے کا طریق کار بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اغوا کے بعد کی ساری کاروائیوں کے اختتام پر ایک شب گاؤں کے معتبروں کا لڑکے کے گھر کٹھ ہوتا ہے۔ لڑکے والے تین چار بکروں کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت دیگوں میں پکاتے ہیں۔ جمع شدہ پنیر اور

بالائی نکالی جاتی ہے۔ پوڑے نما روٹیاں بنتی ہیں۔ بکرے کا جگر پکا کر اُسے محفل میں موجود دولہا دلہن کے ہاتھوں میں پکڑایا جاتا ہے ایک بہت قریبی عزیز حاضرین کی اجازت سے تیز مٹھرے کے بھرپور وار سے اُس جگر کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دیتا ہے۔ ایک ٹکڑے کا مرد کے ہاتھ میں اور دوسرے کا عورت کے ہاتھ میں رہ جانا نکاح کی علامت ہے۔ اسکے فوراً بعد لڑکی کے والد کا اپنے داماد سے کسی قیمتی چیز کا مطالبہ ہے۔ دعائیہ جملوں کے بعد کھانے کا عمل ہے۔

کالاشی مرد جھگڑالو نہیں۔ امن پسند ہے۔ کالاش سوسائٹی میں اسکی حیثیت کا اندازہ اسکی بیویوں کی تعداد سے ہوتا ہے۔

کبخت مارے دنیا بھر کے مردوں کو کیسا ہوکا ہے شادیوں کا۔

شلوار پہناؤ رسم میں چھ سال کے بچوں کو پہلی بار سیاہ اُون کی شلواریں پہنا کر بکروں کی قربانیوں دعوتوں اور بچوں کو تنہا پر اب (دیوتا) بھیج کر کالاشی بنایا جاتا بھی ہمارے معاشرے کی ایک دلچسپ رسم ہے۔

اور پھر چاؤ موس تہوار کا سب سے خوبصورت اور دلچسپ پروگرام چانجا۔ تاریک رات کا پہلے پہر کا سناٹا ڈھول کی آوازوں سے تھرا اُٹھتا ہے۔ سیاہ پیرھنوں میں لپٹی گھنگھر و بجاتی تک سک سے آراستہ عورتیں اور چترالی ٹوپوں پر مرغ زریں کے پروں کے پھول سجائے مرد حضرات ہاتھوں میں چیز کی جلتی لکڑیاں تھامے ناچتے گاتے اوپر قربان گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ پوری رات برف پر رقص اور مے نوشی ہوتی ہے۔ دیوتاؤں کے حضور قربانیاں اور سردار کا انتخاب۔ سردار کا گوبر کے ٹکڑے میں سوراخ کرنا اور اس میں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے پشین گویاں کرنا۔ پھر قربانی اور خون کے چھینٹوں کا لوگوں پر چھڑکاؤ۔

لاکھ شاہہ خان کا انداز بیان سادہ اور افسانوی ٹچر سے مبرا تھا۔ پر میں اپنے تصور کی اُس آنکھ کا کیا کرتی جو وادی کے طول و عرض پر پھیلے کینوس پر ایک ایک منظر کو پینٹ ہوئے دیکھتی تھی۔ یاس میں ڈوبی بڑی لمبی آہ میرے سینے سے نکل کر ہونٹوں تک آئی تھی جس نے پوچھا تھا۔

چاؤ متوں کو اگر دیکھنا ہو تو دسمبر میں یہاں آنے کی صورت کیا ہے۔

بڑی اہتر۔ اسکا لہجہ قطعیت سے پُر تھا۔

لواری ٹاپ بند۔ Flights کو تو عام دنوں میں بھی موسم کی ذرا سی چھینکوں پر نہ آنے کا بہانہ چاہیے۔ دسمبر میں تو بیچارہ شدید قسم کے فلو میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پشاور سے افغانستان کے شہر جلال آباد کے راستے ارند و موڑ سے جس پر آج کل سفر خطرے سے خالی نہیں۔ یوں اگر چترال پہنچ بھی جائیں تو ہم تک آنے کے لیے دس بارہ فٹ برف سے اٹے راستے حائل ہوں گے۔ چلو قصہ ختم۔

آیون میں گاڑیوں کا اڈہ کبھی آیون کا پولو گراؤنڈ تھا۔ پر اب اڈہ تھا جہاں ڈھول اور مٹی اڑتی تھی۔ سہ پہر کی دھوپ کا جو بن آنکھوں کو چنڈھیا تا تھا۔ لوگوں کی گہما گہمی تھی۔ مشروبات کی ایک دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر پانی کا گلاس پیتے ہوئے میں نے کسی سے پوچھا۔

”سیار بابا کا مزار کہاں ہے؟“

”وہ سامنے والے پہاڑوں کے دامن میں۔“ میں نے تیز دھوپ میں نظریں دوڑائیں۔ سوچا کہ چلو لگے ہاتھوں یہ معرکہ بھی سر کر لوں کہ کھوار کے اس عظیم شاعر کے مزار پر حاضری بھی ضروری ہے۔ تھوڑا سا چلی بھی۔ پر یقیناً کوئی ٹھٹھ گھڑی ہی تھی کہ جس نے بڑھتے قدموں کو روک دیا ورنہ دھوپ میں یہ لا حاصل مہم جوئی اس شام مجھے چترال سول ہسپتال میں پہنچا سکتی تھی کہ سیار بابا بیچارہ وہاں کہاں تھا۔ اب یا تو لڑکا لا علم تھا یا پھر مجھے بیوقوف بنا گیا تھا۔

واللہ علم بالصواب۔

## پریس کلب۔ شاہی قلعہ اور دینین کا ایک گھر

شام گرم تھی پر چترال پریس کلب کے سرسبز لان میں گرسی پر بیٹھے حیات اللہ گرسی کی باتوں سے چھلکتی تلخی اور گرمی دونوں موسم سے کہیں سواتھیں۔ قبوہ انہوں نے خود بنایا تھا اور بصد اصرار مجھے دوسری پیالی دیتے ہوئے کہا تھا ”اسے ضرور پیئیں یہاں کے خشک موسم کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین ہے۔“

سیاہ اور سفید رنگی کچھڑی داڑھی گھنی مونچھوں طنز سے لبریز آنکھوں اور زہریلی گفتگو کا گولہ بارود برساتے ہونٹوں والا اونچا لمبا یہ درویش سا شخص پریس کلب کے لمبے چوڑے خالی کمرے میں بستر بند پر لیٹا ہوا تھا جب میں نے کمرے میں داخل ہو کر اپنا تعارف کروایا تھا۔

”آئیے آئیے“ خوشدلی سے کہتے ہوئے وہ اٹھے گرسی میری طرف بڑھائی۔

اندر کے مقابلے پر باہر کا موسم زیادہ خوشگوار تھا یہی سوچتے ہوئے میں نے قدم دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چلیئے باہر بیٹھتے ہیں۔“

گفتگو کے پہلے مرحلے میں انہوں نے پریس کلب کی زمین، بینظیر کی طرف سے ملنے والی پانچ لاکھ گرانٹ، بلڈنگ کیسے اور کس طرح بنائی گئی وغیرہ کا ذکر کیا۔ گفتگو کا دوسرا مرحلہ صحافیوں کی زبوں حالی اور اخباروں کی طرف سے ملنے والے قلیل معاوضے سے متعلق تھا۔ چار

پانچ سو کا معاوضہ جبکہ فیکس کا خرچ بھی صحافی کے ذمے۔ بڑی جاندار شکایات تھیں۔

تیسرے مرحلے میں آغا خان ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت صوبے بھر میں چلنے والے  
تعلیمی ادارے زیر بحث آئے۔

گفتگو کا چوتھا مرحلہ بڑا خوفناک تھا۔ اُنکی آنکھوں اور ہونٹوں کے زاویے طنزیہ انداز  
کے بھرپور عکاس تھے۔

چترال سنٹرل ایشیا کا گیٹ وے ہے۔ بہتر ہے اسے امریکہ کو لیز پر دے دیا جائے۔  
”کیوں آخر“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

اس لئے کہ ہم پاکستان سے چھ ماہ کے لئے کٹ جاتے ہیں۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُنکا ساتھی جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اٹھا اور اندر سے ڈیلی  
مسلم کا ایک تراشہ لاکر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اس میں وہی کچھ لکھا تھا  
جو وہ مجھے بتا رہے تھے۔ آپکو پتہ نہیں یہاں کا بااثر طبقہ امریکی ایجنٹ ہے ہر ماہ امریکی سفیر قلعے  
میں آتا ہے دعوتیں اڑتی ہیں۔

بڑی زہریلی قسم کی مسکراہٹ تھی جو حیات اللہ گریزی کی آنکھوں ہونٹوں اور  
مونچھوں کے بالوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

”مگر ہوگا کیا۔ یہ سب لوگ مل کر چائنا کے خلاف ہونگے اور میزائلوں کی لڑائی میں یہ

پُر امن خطہ تباہ ہو جائے گا۔“

یقیناً اس سے زیادہ سُنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ آسمان پر شام بہت تیزی سے اتر رہی

تھی میں نے پھر کسی دن آنے کا کہتے ہوئے اجازت لی اور باہر آ گئی۔

اسپتال روڈ سے شاہی قلعہ روڈ پر آ کر میں نے لمبا سانس بھرا قدموں کو تیز کیا اور اُس

موڑ پر آ کر رُک گئی جہاں میرے سامنے شاہی قلعہ اور بائیں ہاتھ شاہی مسجد تھی۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ ”نماز کہاں پڑھوں“۔ شاہی مسجد میں۔ تو بہ میں نے

کانوں کو ہاتھ لگایا۔ مسجد خالی ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ آدھا چترال اس وقت یہاں موجود ہوگا اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

”شاہی قلعہ میں“ میں نے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔

اجازدیران اور شکتہ قلعہ خوف کی ٹھنڈی لہریں میرے سارے سریر میں اترنے لگیں۔ وہ نیلی چھت والا محافظ ہوگا۔ لکڑی کے سال خوردہ بڑے سے گیٹ کے چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہوگئی اور گھاس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا اس عظیم ہستی کے حضور جس نے بقا کو صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ کسری نماز دو منٹ میں ختم۔ ”دعا“ دریا کے کنارے۔ دل نے کہا۔

”باہر چلو“ سناٹے اور ویرانی سے ہول کھاتے ہوئے میں نے کہا۔ یہ نئی نئی جدتیں کسی مصیبت میں نہ مبتلا کر دیں۔

کس قدر گھمبیر ویرانی تھی۔ غلام گردشوں میں ہو کا عالم اعصاب کو چٹخا رہا تھا۔ چنار کے بوڑھے پھیلے ہوئے درخت نے فضا کی دہشت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

دوسوں اور اندیشوں کو زور دار ٹھوکر میں مارتے ہوئے میں قلعے کی عقبی سمت بھاگی۔ ٹوٹی پھوٹی راہداریوں اور بالکونیوں میں سے کسی بگولے کی مانند چکر کھاتی ہوئی وہاں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے خوبصورت مکانات اوپر نیلا آسمان اور درمیان میں دریائے چترال چٹکھاڑیں مارتا بہہ رہا ہے۔ دائیں ہاتھ پھر ٹوٹی ہوئی گیلریوں اور بالکونیوں کے سلسلے ہیں۔

اندھیرے کی چادر میں لپٹی جاتی اس شام کے ماند پڑتے خُسن کی چھاؤں میں میرے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے تھے۔ میری دعائیں کیا ہیں۔ ممتا کے خود غرض تانوں بانوں میں ابھی ہوئیں۔ جب راز و نیاز کے سلسلوں سے فارغ ہوئی۔ ہوش کی آنکھوں نے گرد و پیش پر چھائے اندھیرے میں سازے ماحول کو آسپب زدہ سادیکھا تو حلق سے چیخ نکلتے نکلتے بچی۔ بھاگی بگٹ بھاگی۔ قلعے کے دروازے سے باہر آئی۔ ایک جگہ ٹھوکر بھی کھائی شکر ہے گری نہیں۔ دھک دھک کرتا دل سڑک پر آ کر پڑ سکون ہوا۔

چلتے چلتے میں نے سوچارات کے لئے کچھ خرید لوں۔ ”پر کیا۔“

کباب وغیرہ ہرگز نہیں۔ معدہ اب اس قابل نہیں تھا کہ ایسی چیزوں کو ہضم کر سکے۔ پھل۔ کون سے پھل؟ میں نے جل کر اپنے آپ سے کہا۔ خوبانی کہیں سوغات کے طور پر بھی نظر نہیں آئی تھی۔ تو ت کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ سیب ابھی بیچارہ منا چٹنا سادر ختوں پر بچپنے کے سنہری دنوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ لے دے کے بس ایک آم تھا جو میرے لئے گھر کی مرغی دال برابر کے مترادف تھا۔ مغرب کے بعد چترال بازار بند ہو جاتا ہے۔ جلدی کرنی چاہیے کا سوچتے ہوئے میں رُکی کہ اس سمت سے آتی کسی گاڑی سے لفٹ لوں۔

تیز روشنیوں نے مجھے گویا کسی گاڑی کا سگنل دیا۔ میں نے ہاتھ ہلایا پجارو میرے قریب آ کر رُکی جسے پندرہ سولہ سال کا ایک نو عمر لڑکا چلا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکتے اسکے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بیٹے مجھے پُچھو پل تک جانا ہے اگر آپ اس طرف جا رہے ہیں تو مجھے لفٹ دے

دیں۔“

خوش مزاج لڑکے نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ گلہری کی طرح پھدک کر میں اندر تھی۔ تعارف کے مراحل طے ہوئے تو مجھے احساس ہوا میرا مان بہت ملنسار اور بیباک ہے۔ باوجود نوعمری کے بھاری اور قیمتی گاڑی کو احتیاط سے چلا رہا ہے۔ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ بڑے بھائی اور والد کے ساتھ مل کر پٹی کا بزنس کرتا ہے۔ پُچھو پل کو کراس کرتے ہی اُس نے کہا۔

”آئی دینین میں میرا گھر ہے۔ آپ چلیے۔ میری بہنیں اردو بول اور سمجھ سکتی ہیں۔ میری ایک بھانج پشاور میں کافی عرصے سے رہ رہی ہیں وہ بھی آجکل یہیں ہیں۔ یقیناً اُن سے آپکی ملاقات مفید رہے گی۔“

”لو بھلا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔“ میں خوش ہو گئی تھی۔

دینین روڈ پر گاڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ میل چلنے کے بعد گاڑی

مڑی اور پھر عمودی چڑھائی کے ساتھ ہی ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئی۔  
میرامان مجھ سے آگے چلتا تھا۔ اور قدم قدم پر رک کر مجھے گائیڈ کرتا جاتا تھا۔ آئی  
یہاں سے آئی اس طرف سے۔

گھر میں داخلہ کچن کے راستے ہوا۔ بڑے سے چولہے پر دھری توی پر دو خوبصورت  
لڑکیاں بڑی بڑی روٹیاں پکانے میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ میرامان کی بھانج اور بہن ایک  
اجنبی خاتون کے اندر آنے پر اٹھیں۔ میرامان نے کھوار زبان میں تیز تیز بولتے ہوئے انہیں کچھ  
بتایا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے حال احوال دریافت کیا اور پھر بڑے کمرے میں قالین پر سب  
کے ساتھ نشست جم گئی۔ میرامان کی پشاور والی بھابھی کہیں گئی ہوئی تھیں۔

یہ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ پوربی سمت کی ساری دیوار شیشے کی تھی۔ بڑے خوبصورت جدید  
چنٹ والے پردے تھے۔ گھر خاصا ماڈرن اور نیا تعمیر شدہ تھا۔ قالین پر چھوٹے بڑے ہر سائز کے  
بچے لوٹنیاں لگا رہے تھے۔ ٹی وی آن تھا اور کمرہ خوب گرم تھا۔ میری موٹی قمیض کے نیچے میرے  
بدن سے پسینے کی دھاریں بہہ بہہ کر اُسے بھگور ہی تھیں۔ اُس سے اگر کہیں میری بیٹی سامنے ہوتی تو  
یقیناً میں اسکی تکہ بوٹی کر ڈالتی جس نے ماں کو ماڈرن بنانے کی چاہت میں اُسکے کپڑوں کو جولا ہے  
کے جنوائی کی طرح کلف سے اکڑا دیا تھا۔ وہ کلف اب مجھے بچھوؤں کی مانند کاٹ کھائے جا رہی  
تھی۔ جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں اور دریائے چترال میں چھلانگ مار دوں جو چند بالشتوں کے  
فاصلے پر مست خرامی سے بہہ رہا تھا۔

تبھی میں نے ایک بے حد دلکش لڑکی کو ڈیپ فریزر میں سے گوشت کی ٹرے نکال کر  
باورچی خانے کی سمت جاتے دیکھا۔

خطرے کی گھنٹی کہیں میرے قریب بجی۔ یہ اہتمام یقیناً میری خاطر مدارت کے سلسلے  
میں ہے۔ یہ گوشت پکانے بیٹھ گئیں تو رات یہیں ہو جائے گی۔

”ارے“ میں نے اُسکا دامن پکڑا جب وہ میرے پاس سے گزری۔

”یہ کس کے لئے پکانے لگی ہیں؟“

”آپ کے لئے۔“ اُس نے ہنستے ہوئے اپنی نشلی آنکھوں سے میری طرف اشارہ دیا۔

”خدا یا۔“ میں نے فی الفور کھڑے ہو کر اُس کے ہاتھوں سے پکڑ لی۔

میں صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوئی تھی۔ بمبوریت کے پہاڑوں سے ٹکریں مارنے کے بعد

آیون میں بھی تھوڑی سی کوہ پیائی کر آئی تھی۔ میری آنکھوں میں تھکن جالوں کی صورت اتر رہی

تھی۔ بصارت دُھندلا رہی تھی۔ میرا جسم وہیں قالین پر لم لیٹ ہونے کو چاہ رہا تھا۔

میں نے اُس گل رنگ چہرے پر محبت پاش نظریں ڈالیں اور ملتی لہجے میں کہا جو گھر میں

پکا ہوا ہے بس وہی لے آؤ۔

”ارے بھنڈی پکائی ہے۔“ میرا مان کی بہن کی ہنسی خفت بھری تھی۔

”لو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ بھنڈی تو میری پسندیدہ ڈش ہے۔“

چاولوں کی قاب آئی۔ بھنڈی آئی۔ کٹاپیاز اور ٹماٹر کا سلاڈ آیا۔

میں کھانے سے فارغ ہوئی ہی تھی جب میرا مان کی پشاور والی بھانج اور اسکا بڑا بھائی

نور شاہدین جو A.K.R.S.P میں بطور مینجر ڈیپوٹیشن پر دو سال کے لئے پشاور سے چترال آیا

ہوا تھا کمرے میں داخل ہوئے۔ دھان پان سی میرا مان کی یہ بھانج کس قدر ملنسار تھی۔ اس میں محبت

کی گرمی اور بے پایاں خلوص کی مہک تھی۔

باتیں شروع ہوئیں۔ میرا گلے دن کا پروگرام زیر بحث آیا۔ میں نے شوگرام اور ریش

جانے کے متعلق بتایا۔

”سیار بابا کی زیارت پر جانا چاہتی ہیں۔“ نور شاہدین نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ہم لوگ صبح مستوج جا رہے ہیں۔ شوگرام راستے میں ہے۔ آپکو وہاں

ڈراپ کر دیں گے۔ ریشن میں عزیز ہیں۔ اُن سے آپکا تعارف بھی کروا دیں گے۔ آپ کے لئے

آسانی ہو جائے گی۔ سچی بات ہے کہ یہ اتنی فراخ دلانہ پیشکش میری آنکھوں سے نیند اور میرے جسم

سے تھکن یوں لے اڑی تھی جیسے نرائے کا شہزادہ یونانی شہزادی سین کو لے اڑا تھا۔

میں جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ میرا مان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے

تہہ دل سے اس فیملی کا شکر یہ ادا کیا جو رات کے سناٹے میں میرے لئے گھر کے کپاؤنڈ میں ایک

دوسرے کے پاس پاس کھڑے تھے۔

## شوگرام سیار بابا۔ ریشن

### اور یارمن ہمیں

اُس سے آسمان اتنا نیلا اتنا شفاف اور اتنا روشن نظر آیا تھا کہ اسکی سمت دیکھتے ہوئے میری ساری حیات عجیب سے محسوسات کی زد میں تھیں۔ دھوپ کی تیزی کو ہوائیں کاٹ رہی تھیں۔ دریائے مستونج کا سینٹ گھلا پانی فضا پر چھائے اس الوہی سناٹے کو چیختے چنگھاڑتے اور شور مچاتے توڑ رہا تھا۔ دریائے مستونج کے طول بلد کا حساب کتاب تو خیر ذرا مشکل بات تھی پر عرض بلد تو میدانی علاقے کی کسی عام نہر جتنا ہی تھا۔ میدانی علاقوں کی نہروں کی کیا بات کس سبک خرامی کس وقار اور کتنی عاجزی سے بہتی ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ شاذ و نادر ہی آپے سے باہر آنے کی نوبت آتی ہے۔ اور یہاں گھن گرج کا وہ عالم تھا کہ جیسے شیر جنگل میں دھاڑتا ہو۔

میں مستونج روڈ پر کھڑی تھی چپ چاپ گم گم تن تنہا اور کسی قدر خوف زدہ سی۔ نور شاہدین اور جیلانی صاحب مجھے اُتار کر آگے بڑھ گئے تھے۔

میں نے دیکھا تھا پتھر یلا ڈھلانی راستہ آگے جا کر معلق پل سے جا ملتا تھا۔ لکڑی کے تختوں اور لوہے کی تاروں سے بنایا یہ پل دیکھنے میں کچھ اتنا مضبوط نظر نہیں آتا تھا۔ پھر عمودی چڑھائی تھی اور پارے یقیناً شوگرام کا گاؤں تھا۔

میراجی وہیں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ شاید میں فضا پر چھائے سناٹے کو اپنے اندر اُتار لینا چاہتی تھی۔ شاید میں دعائیں مانگنے کی آرزو مند تھی۔ پردہاں سایہ نہیں تھا۔ پھر میں نے دھیرے

دھیرے پاؤں جما جما کر ڈھلانی راستہ اترنا شروع کیا۔ مستوج روڈ کی دیوار میرے داہنے ہاتھ کو سہارا دیئے ہوئے تھی۔ دفعتاً میرا پاؤں بجری پر پھسلا اور میں قدرے لڑھکتی ہوئی پل کے ستون سے جا ٹکرائی۔ صد شکر کہ یہ ٹکراؤ ستون کے ساتھ ہی ہوا۔ پشت پتھروں کی دیوار سے نکاتے ہوئے لمبی سانس بھرتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔ میاں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ”چین نہیں تجھے آرام کی گرائی لڑتی ہے۔“

سورج سے بچاؤ کی جو تھوڑی سی جگہ مجھے نظر آئی وہیں کھڑے ہو کر نظاروں کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے بے اختیار میں نے کسی انسانی صورت کسی آواز کسی جانور یا پرندے کی چہچہاہٹ کو دیکھنے اور سننے کی خواہش کی پروہاں دریا کی شوریدہ سرلہروں کے شور کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پل کے لوہے کے رے کو پکڑ کر چلنا شروع کیا۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ لگتا تھا جیسے جی جان سے چاہتی ہوں کہ مجھے اٹھا کر دریا میں پھینک دیں۔ قمیض کا دامن اور ڈوپٹہ ہاتھوں سے نکل نکل جاتے تھے اس ناراض فلمی ہیرو کی طرح جو اپنی دلنواز محبوبہ کی بانہوں کے دائروں کو رکھائی سے جھٹکتا اور توڑتا ہر بھاگتا ہو۔ لکڑی کے تختے چلنے سے جھولتے تھے۔ دریا کی شوکریں دل دہلائے دیتی تھیں۔ دفعتاً میرا جی پل کے تختوں پر بیٹھ کر لوہے کی تاروں کے جال سے بنے سہاروں میں ٹانگیں پھنسا کر انہیں نیچے دریا پر لکانے کو چاہا۔ ایک لمحے کے لئے رُک کر میں نے اپنی اس بے تکی خواہش کی معقولیت کا جائزہ لیا۔ دوسرے لمحے اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا انداز بڑا تاسف بھرا تھا۔ نہایت فضول عورت ہوں میں بھی۔ کبھی کوئی معقول بات کوئی تک کی سوچ تو ذہن میں آئے گی نہیں جب سوچوں گی ایسی ہی بوگی اور بے تکی باتیں۔ مہم جوئی میں جتنے پنگے لے سکتی ہوں چلو وہ تو ٹھیک ہے۔ پر ان پنگوں میں بھی مزید پنگے لینا کہاں کی دانائی ہے۔ لہذا بندی بنو۔ آنکھ جھپکنے تک کے وقفے میں سینکڑوں فٹ نیچے جاسکتی ہو۔ پچھلے بیچارے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگر تمہیں یہاں بھیج بیٹھے ہیں تو کچھ ان کی عزت و آبرو کا خیال کرو۔

زمین پر پاؤں رکھا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک نظر دریا پر اور دوسری اپنے سامنے عمودی چڑھائی پر ڈالی۔ عین اُس وقت ہاتھ روم جانے کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ یہاں اس ویرانے میں اس کا رخیر کے لئے جگہ تو بہتری تھی پانی بھی ٹنوں کے حساب سے موجود تھا۔ پر ”اگر“ کے سلسلے ہر اسام کئے دیتے تھے۔ کسی انسانی صورت کا اچانک ظہور پانی تک رسائی کے لئے خوفناک اترائی ایک اور آپشن صحرائی خشکی والی بھی سامنے تھی۔ لیکن وہ مجھے قبول نہ تھی۔ اجنبی جگہوں پر مختصر کسری نماز کے سجدے جو لطف و انبساط اور سرور بخش رہے تھے اُن سے محرومی مجھے ہر گز گوارہ نہ تھی۔ روح کا گند اور زنگ دونوں اتر رہے تھے ایسے میں بدنی پاکیزگی کا متاثر ہونا بھی پسند نہ تھا۔

” اُف میرے اللہ مجھے صبح اتنا سارا پانی نہیں پینا چاہیے تھا“ میں نے روکھی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔

دراصل گذشتہ چند سالوں سے ڈی ہائیڈریشن کا مسئلہ جان سے چمٹ گیا ہے۔ گردوں کی فلٹریشن ہمہ وقت ہونی ضروری ہے۔ ہر صبح اٹھنے کے بعد میرا پہلا کام ڈھیر سارا پانی جسم کے اندر کرنا ہوتا ہے۔ آج سویرے آنکھ دیر سے کھلی باہر نکل کر دیکھا چترال کی یہ صبح اپنے اندر ہلکی ہلکی سی خشکی لئے ہوئے بہت خوبصورت لگی تھی۔ چونکہ سات بجے روانگی تھی اس لئے پانی اُس تو اتر سے نہ پیایا گیا یوں بھی دو معزز مردوں کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ چائے کا ایک کپ پینے کے بعد میں تیار ہو کر ریٹ ہاؤس سے باہر درخت کے سائے میں پتھر پر بیٹھ گئی میرے لئے یہ بات ہمیشہ ناپسندیدہ رہی کہ اپنے ساتھ لے جانے والا شخص مجھے کھوج کرنا پھرے۔

اچانک مجھے اپنے کلیجے میں جلن کا احساس ہوا۔ خیر سے تیز چائے اپنا کام دکھا رہی تھی۔ ”یار کوئی پرابلم نہ ہو جائے“ خوف زدہ سی اپنے آپ سے بولتی ریٹ ہاؤس کی طرف بھاگی کچن کے فرج سے ٹھنڈی ٹھار بوتل نکال کر لبالب بھرے دو گلاس پئے اور پھر سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہوئے دوبارہ اُسی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ ٹھیک سات بجے A.K.R.S.P کی گاڑی سڑک

پرز کی نور شاہدین صاحب نے مزاج پُرسی کی۔ نئی نویلی گاڑی کا بیک ڈور کھولا۔ ہم دونوں نے آمنے سامنے کی سیٹیں سنبھالیں۔ ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ایک اور صاحب سے تعارف ہوا گنگھر یا لے بالوں والا اونچا لمبا کوہستانی مرد جیلانی صاحب A.K.R.S.P میں بطور مینجر کام کرتے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کے دور میں بنائی گئی یہ سڑک بہت شاندار ہے۔ بونی تک کارپینڈ آگے شندھور تک چکی۔

گاڑی نئی ڈرائیور ماہر سڑک عمدہ اور دو مقامی لوگوں کی سنگت باتوں میں راستے کی خوبصورتی اور حُسن پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔

پھر لواری ٹنل سے متعلق وہ سوال میرے ہونٹوں پر آگئے جنہیں میں نے اپنے مختصر سے قیام کے دوران ہر چترالی کی دکھتی رگ کے طور پر محسوس کئے تھے۔

”آخر کیا وجہ ہے؟ حکومت اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتی فنڈز کی دستیابی کا کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی بیرونی عنصر اسکی تکمیل میں رکاوٹ کا باعث ہے؟“

نور شاہدین گورنمنٹ ملازم تھے۔ ڈیپویشن پر آغا خان دیہی ترقیاتی پروجیکٹ پر پشاور سے دو سال کے لئے چترال آئے ہوئے تھے یوں رہنے والے چترال کے ہی تھے۔ میرے سوالوں کی یلغار پر رسان سے بولے۔

”بھٹو کے زمانے میں کام تو شروع ہوا تھا پھر بند ہو گیا۔ دراصل دیر اور چترال کے درمیان ۱۰۵۰۰ فٹ بلند اس درزے پر اخراجات کا جو تخمینہ لگایا گیا تھا وہ اسکی افادیت کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔“

”کمال ہے ایسے اہم منصوبوں کی پلیننگ دیہاڑی ڈنگوں کے لئے تھوڑی ہوتی ہے اُنکا دائرہ کار تو سینکڑوں سالوں پر محیط ہوتا ہے۔“

سرکاری افسر نے مسکرا دینے میں ہی اپنی عافیت جانی تھی۔ کہتا بھی کیا۔ حکمرانوں کو اپنے الٹے تلووں اور اپنے مفادات کے تحفظ سے فرصت ملے تب تا بھاڑ میں جائیں لوگ اور

چولہے میں جائیں انکے زندگی و موت سے متعلق مسائل۔

ریشن پہنچ کر رُکے۔ گاڑی کا بیک ڈور کھولتے ہوئے نور شاہدین نے سڑک پر چھلانگ مارتے ہوئے کہا۔ ”آئیے اپنے عزیزوں سے آپکا تعارف کروادوں۔ شوگرام سے فارغ ہو کر اس وادی میں آجائیں۔“

میں قدرے احتیاط سے اُتری۔ چھلانگیں مارنے والی عمر اب نہیں رہی تھی لہذا ڈرتی تھی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر تازہ خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا سے اپنے آپکو نہال کرتے ہوئے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ چند دوکانیں تھیں۔ بائیں طرف درختوں سے گھرے دو تین مکان اوپر سے بہتی آتی ننھی مٹی سی کھال۔

نور شاہدین کی عزیزہ گھر کے سامنے مرغیوں کے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ چھٹی قامت پر قدرے بھاری وجود طباق سے چہرے پر موٹی موٹی محبت بھری آنکھیں نور شاہدین کھوار زبان میں تیز تیز جانے کیا کیا بولے چلا جا رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھیں۔

مجھے گلے لگاتے ہوئے انہوں نے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔ پھر انہوں نے شاہدین کو گھر کی طرف زور و شور سے بلانا شروع کر دیا۔ پر شاہدین ہاتھ ہلاتے ہوئے کچھ بولتے ہوئے گاڑی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی اُنکے تعاقب میں تھی۔ گاڑی میں لدائی کے بعد جب ذرا سانس درست ہوئی نور شاہدین کی آواز پر میں نے باہر کی جانب توجہ کی۔

دیکھئے ذرا سرخ مٹی سرخ پہاڑ سیار بابا کا کہنا تھا۔ کہ ان پہاڑوں اور اس مٹی نے انکے محبوب کے ہونٹوں کی لالی پُرائی ہے۔

یہ عاشقی بھی کیا چیز ہے زمین و آسمان کے قلابے ملانا سکھا دیتی ہے۔

دفعتا گاڑی کی رفتار بہت مدہم ہو گئی۔ یہاں سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی بارش کے پانی کے

لئے چینل بن رہے تھے پہاڑوں کے دامنوں میں دھواں دھار قسم کا کام ہو رہا تھا۔

اور پھر شوگرام آ گیا۔

عمودی چڑھائی چڑھ کر جب میں ہانپتی کانپتی ایک جگہ ستانے کے لئے کھڑی ہوئی مجھے داہنے ہاتھ ایک بوڑھی عورت دکھائی دی۔ بے سرے سے ملکچے کپڑے تبتیوں کی طرح نقش و نگار والا چہرہ سیدھی مانگ میل سے اٹے ہوئے بال جنگی گندھی ہوئی مینڈھیاں پتلے اور لاغر سانپوں کی مانند اسکے سینے پر دوڑی پھرتی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسکی تگونی آنکھوں نے پھلنے کی پوری کوشش کی۔ آنکھوں کے اس پھیلاؤ سے میں ڈرسی گئی۔ یکدم میں نے کہا۔ ”سیار بابا کی زیارت۔“

زیارت زیارت زیارت اُسے اپنے سینے پر ہاتھ مارا دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا پھر پوپے منہ کو کھول کر ٹوٹی پھوٹی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے جانے کیا بولنا شروع کر دیا۔ میں ہونقوں کی طرح کھڑی اُسے دیکھتی اور سُنتی تھی۔

پھر اسکے کھر درے خشکی سے پھٹے ہاتھوں نے میری کلائی تھامی اور مجھے گھسینا شروع کر دیا۔ یقیناً وہ مجھے سیار بابا کی زیارت پر لے جانا چاہتی تھی پر زیارت سے پہلے ایک مسئلہ حل کرنے والا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانا چاہا پر اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی دیر اُسکے ساتھ جھک مارنے کے بعد میں نے عملی مظاہرہ کرنے کا سوچا۔ میرے ایکشن کو اُس نے سمجھا۔ شفقت بھری ہنسی اُسکی آنکھوں میں پھیلی اور وہ مجھے ہاتھ سے تھام کر ایک ایسی جگہ لے آئی جو یقیناً موشیوں کا باڑہ تھی۔ گوبر توڑی اور گند مند سے فرش اٹا پڑا تھا شکر تھا کہ چھت نہیں تھی وگرنہ بو سے سر پھٹنے لگتا۔

جباب کے گاؤں کے موشیوں کے باڑوں میں جانے کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔ پتھروں کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ دروازہ مضبوط تھا۔ تفصیلی جائزے نے مجھے مطمئن تو کر دیا پر مسئلہ پانی کا تھا۔ میں نے اونگے بو نگے طریقے سے اُسے مدعا سمجھایا وہ باہر گئی اور جب چھوٹی سی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئی تو اُسے دیکھتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی اُسکے ہاتھ میں مٹی کا بڑا سا روزا تھا۔

”خدایا“ میں نے ہنسی روک کر آب آب کہا یہ سوچتے ہوئے کہ کھوار اور فارسی میں



دیکھا لگا جیسے کسی نے فلیش بیک کا بٹن کھٹ سے دبا دیا ہو۔ اس کو ٹھے میں نصب ایک فٹ لمبائی چوڑائی والے دو پٹوں کے کھر درے سے دروازے نے میرے ہاتھوں میں کھجلی سی کر دی۔ گاؤں میں دادی کے گندم کے پڑولے یاد آئے تھے جن میں ٹھکے ایسے ہی دو پٹوں کے دروازوں کی کنڈیاں میرے ننھے منے ہاتھ دھیرے دھیرے کھول کر گندم کے دانوں سے میلی پختی کا دامن بھر لیتے۔ پھر گاؤں کی ہٹی سے رنگ برنگی مٹیوں (میٹھی گولیاں) مروٹوں اور تل والی گچک کا تبادلہ ہوتا۔ جینٹھ اور ہاڑ کی پتی دو پہریں میرے ایسے ذائقوں چوریوں اور آوارہ گردیوں کی گواہ تھیں۔ زبان کے چنچارے قیمتی گندم کے دانوں کی چوری اور اوا گونیوں کے راز جب طشت از بام ہوئے تو جھونٹے پکڑ پکڑ کر جس جس انداز میں زود و کوب کیا گیا کوسنوں اور بد دعاؤں کی بارش میں جیسے نہلایا گیا اسکی تفصیل قطعاً خوشگوار نہیں۔

اواگون جیسا خطاب اور مستی رہ جاویں“ (یعنی سوئی رہ جاؤ۔ مر جاؤ) جیسی بد دعا مستقل دعا کی صورت میں نصیب ہوئی۔ جب بھی چھٹیاں گزارنے دادی کے چرنوں میں حاضری دی ان سوغاتوں سے جی بھر کر مالا مال ہوئے۔ اور اب کہیں اگر جنت کے کسی روشن دان سے مجھ پر اُن کی نظر پڑ جائے اس اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر زمانے بھر کی تیوریوں سے ماتھا سجا کر اور ہونٹوں کے زاویے سکڑ کر یہی کہیں گی۔ ”اے اسکے تو پور پور میں آوارہ گردی رچی ہوئی ہے۔ سدا کی اواگون“

اور میں نے شفاف آسمان کے سینے پر جمی نگاہوں کو فی الفور ٹھکا کر چلو بھر پانی کی بجائے اپنے گریبان میں جھانک کر مرنے کو بہتر جانا تھا کہ بیچارہ کچھ تو میری آبرو کے بھرم رکھنے کا سزاوار تھا۔

یادوں کے گلشن کھلوانے والے پڑولے کے بارے میں پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس میں گرمی سے بچاؤ کے لئے دودھ رکھا جاتا ہے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنی اہمیت کی حامل شے کو اندر سے نہ دیکھا جاتا۔ دیکھا۔ جگہ اندر سے ٹھنڈی اور اندھیری تھی پر اُس مخصوص باس نے لپک کر

استقبال نہ کیا جو کہیں ناک کے راستے دل و دماغ کے کسی گوشے میں سکڑی بیٹھی تھی اور اس وقت میں اُسکے سحر میں اُبھی ہوئی اُسے سونگھنے کی متمنی تھی۔

”مزار پر چلنا چاہیے“ میں کھڑی ہو گئی۔

”ابھی بیٹھے“ لعل خان میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ لڑکا خوبانیاں توڑنے گیا

ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔ کچھ کھالیں۔

”واپسی پر“

لعل خان آگے میں پیچھے اور میرے تعاقب میں مقامی بچوں کا ریوڑ۔ کھیتوں کی چھوٹی چھوٹی سی وٹیں۔ دائیں بائیں گندم کی سنہری پکی فصل کٹنے کے لئے تیار اور کہیں پوٹھوں کی صورت کٹی پڑی۔ شفتل کے کھیتوں سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو شہوت کے درختوں سے گرے ہوئے پکے ریلے توت جنہیں میں چلتے چلتے رُک کر اٹھا کر کھانے سے باز نہ رہ سکی چمکتا سورج جسکی دھوپ سے بچنے کے لئے میں اطراف میں اُگے درختوں کے چھوٹے سے چھوٹے سائے میں بھی چلنے کو ترجیح دیتی اور اس کاوش میں دوبار کنارے کی چھوٹی سی کھال میں پھسل کر دایاں پاؤں کیچڑ سے لت پت کروا بیٹھی تھی۔

”میں آپکو شوگرام کے ایک بہت پڑھے لکھے آدمی کے پاس لے جا رہا ہوں وہ آپکی

رہنمائی بہتر انداز میں کرے گا۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا“ لعل خان کی بات پر میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

اونچی نیچی پگڈنڈیوں کے خاصے فاصلے طے کرنے کے بعد ایک بڑے دروازے سے جس گھر کے اندر داخل ہوئے تھے اُسے دیکھ کر میں ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی تھی۔ بسنتی قرمزی اور سرخ پھولوں سے اٹا پڑا الان جسکے بیچوں بیچ چارنٹ کا راستہ بہت خوبصورت جدید وضع کے مہمان خانے تک جاتا تھا۔ بڑے گیٹ کے عین سامنے لمبا چوڑا سیمنٹ کا پختہ چبوترہ جس پر چنار کے گھنے درخت کی گھنی چھاؤں تلے موٹے پائیوں والی دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ان

چار پائیوں پر انتہائی قیمتی قالین دھوپ لگوانے کے لیے ڈالے ہوئے تھے۔  
سامنے کی طرف مقامی گھر جسکی کچی دیواریں اور چوڑے دروازے یہ بتاتے تھے کہ  
چترالی خواہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو اُسے سکون اور طمانیت اپنے پرانے طرز تعمیر والے گھر میں ہی ملتی  
ہے۔

چہرے پر چشمہ سجائے کھلتی ہوئی گندمی رنگت والا نوجوان مسکراتے ہوئے ہماری  
پیشوائی کے لئے آگے بڑھا وہ صاحب خانہ سردار زمان ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ تھے۔ پشاور یونیورسٹی  
سے پڑھے تھے اور ریشن ہائی سکول میں بطور سنیر ٹیچر کام کر رہے تھے۔

تعارف ہوا۔ چہوتے پر پڑی دو کرسیوں میں سے ایک انہوں نے میری طرف  
بڑھائی میں سکون سے بیٹھنا چاہتی تھی کہ صاحب خانہ صاحب علم تھا اور علاقے کی صورت حال پر  
سیر حاصل بحث ہو سکتی تھی۔ ایک چار پائی کے قالین کو اکٹھا کرتے ہوئے میں نے جوتے اتار کر  
الانی چار پائی پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا میں ایسے زیادہ ٹھیک ہوں۔“

چنار کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں سامنے دائیں بائیں بلند و بالا پر ہیبت پہاڑ۔ ہنستے  
مسکراتے پھول سرسبز لان اور ہاتھ میں پکڑا روح افزا کا گلاس جی چاہا تھا آنکھیں بند کر لوں اور  
فطرت کی گود میں سو جاؤں۔

خالی گلاس ابھی ٹرے میں ہی رکھا تھا کہ کروشیے کے سفید رومال سے ڈھنپا خوبانیوں کا  
تھال آ گیا یہ تحفہ لعل خان کے گھر سے آیا تھا۔ خوان پوش کا سر کنا تھا کہ سامنے سنہری رسیلی اور دلڑ با  
خوبانیوں کا جہان نظر آیا۔ جنت میں اگر ایسے ہی پھلوں کی بشارت ہے تب وہاں نہ جانا کتنے  
افسوس کی بات ہوگی۔ اپنی آنکھوں کا ندیدہ پن اپنی زبان کا رال پکانا اور اپنے ہاتھوں کا اُن پری  
دشوں کا قیمہ بنانے کا اضطراب مجھ پر آشکارا ہو گیا تھا۔ میں نے سب کو کھلی چھٹی دے دی۔ کسی پر  
بند لگانے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے جب صورت حال اتنی حوصلہ افزا ہوگی اور حملہ آور ایسے دلیر

اور جری ہوں گے تو کشتوں کے پتے لگنا فطری بات ہے۔

جب سیار بابا کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اسوقت دھوپ پورے عروج پر تھی۔ گو مزار کا راستہ کشادہ تھا۔ پر چڑھائی اور اترائی دونوں سانس مٹھلائے دیتی تھیں۔ اطراف میں اُگی سچور کی جھاڑیاں دامن پکڑتی تھیں۔ قبر شکستہ تھی۔ بانس کے ڈنڈوں سے لٹکتے رنگ برنگے پھریرے منتوں اور مرادوں کی تکمیل کے نمائندے تھے۔ قبر کے سرہانے اور پائنتی زنگ آلود لوہے کے دو فٹ لمبے پترے گڑے تھے۔

ان کی غرض و غایت کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ سنی اور آغا خانی قبروں کی تخصیص کے لئے ہیں۔ فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھائے اختتام پر چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لیتے ہی میری نظریں ادھر ادھر پھیل گئیں۔

شوگرام پائین کی خوبصورت وادی عین میرے سامنے بہت نیچے کسی خوبصورت انگٹھی میں چمکتے دکتے ہیرے کی مانند نظر آئی تھی۔ دہنی سمت زوموسور کا وہ پہاڑ تھا جہاں بیٹھ کر سیار بابا اپنی محبوبہ کے گاؤں کو دیکھتے اور اس کے عشق میں ڈوب کر شاعری کرتے۔ میری پشت پر وہ پہاڑ تھے جن کے سینوں پر بہت سی دیواروں کے آثار سردار زماں کی نشاندہی پر میں نے دیکھے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے کیوں آئے اور پھر کہاں چلے گئے؟ پتھروں کی دیواریں ٹوٹے پھوٹے گھر آگ جلانے کی جگہیں برتن کچھ ادھوری داستاںیں سناتے ہیں۔

اس سے انسانی حیات اور اسکی ہجرتوں کی بابت بے شمار سوال ذہن میں پیدا ہوئے انکے جوابات کا سلسلہ کہیں تاریخی کہیں جغرافیائی کہیں مذہبی اور کہیں معاشی اور معاشرتی عوامل کے حوالوں سے اتنا گنجل دار تھا کہ میں نے گہرا کر سر جھکا اور پستہ قد سبز جھاڑیوں اونچے لمبے درختوں چمکتی دکتی دھوپ اور وادی کے حُسن میں خود کو مصروف کیا کہ یہ وقت صرف ان چیزوں کے لئے تھا۔

”شوگرام پائین چلتے ہیں“ میری خواہش پر سردار زماں آگے بڑھے۔

اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستوں دھان کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں اور چھوٹے چھوٹے کھالوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہم وادی میں اترتے گئے۔ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ شوگرام بالا و پائین پانچ سو سے زیادہ نفوس والی آبادی کا گاؤں ہے۔ لڑکے لڑکیوں کا پرائمری سکول ہے۔ پاس ہی کے زیست گاؤں میں ڈسپنسری ہے۔ جو اپنی مدد آپ کے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ چاول گندم جوار اور سبزیوں میں وادی اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہے۔ پڑھائی کا اتنا رواج ہے کہ مسجد بھی مکتب بنی ہوئی ہے۔ چھٹی جماعت سے نیچے بچیاں ریشن کے مڈل اور ہائی سکول چلے جاتے ہیں ریشن تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔

وادی کی سیر کے دوران لوگوں سے علیک سلیک ہوتی رہی۔ سیاسی صورت حال پر بھی باتیں ہوئیں۔ بھٹو سے لوگ محبت کرتے ہیں اُسے مانتے ہیں۔ مہتروں کے دبائے ہوئے مظلوم انسان کو اُس نے عزت نفس دی تھی۔ چترال کے لئے اس نے بہت کام کیا۔ پیپلز پارٹی کی جڑیں عوام میں تھیں۔ گواہ بھی کسی حد تک ہیں مگر لوگ بے نظیر سے مایوس ہوئے ہیں۔ دوسرے نمبر پر جماعت اسلامی ہے۔ اس جماعت کے کارکن کام کرتے ہیں۔

”اور مسلم لیگ کی صورت حال کیا ہے؟“ میرے اس سوال پر سردار زمان نے بتایا۔ مسلم لیگ کی رُوٹس (roots) نہیں ہیں یہاں۔ صرف پرنس محی الدین کا ذاتی ووٹ بینک ہے وہ اسے جدھر چاہیں کیش کروالیں۔

اب سورج نصف النہار پر تھا۔ میری قمیض کی پشت سے پسینہ بارش کے قطروں کی صورت بہ رہا تھا۔ اخروٹ کے ایک گھنے درخت کے نیچے سستانے کے لئے رُکے ایسی سرشاری والی ٹھنڈک تھی وہاں کہ دل کچھ دیر بیٹھنے کو چاہا۔ موضوع سخن اب سیار بابا تھے۔ سردار زمان صاحب بول رہے تھے۔

کھوار شاعری کو اُن پر فخر ہے۔ اُنکا سارا کلام ایک طرح سینہ گزٹ تھا۔ لوک ورثہ والوں نے اب لوک کہانیوں کے حوالے سے اُن پر کچھ کام کیا ہے۔ عشق مجاز سے عشق حقیقی کی

طرف سفر کرتے ہوئے انکے جذبوں نے جو شاعری تخلیق کی وہ استعاروں، تشبیہوں اور خوبصورت بندشوں سے بچی ہوئی ہے ذرا دیکھئے۔

خوشکو سیر و ژانہ باغ اوج بیاباں مہ بوخوش

آلتی پستیمان بکوسار نو آلتی آرماں مہ بوخوش

ترجمہ: دل جہاں گھومتا ہے وہ راستے وہ باغ وہ بیابان مجھے عزیز لگتے ہیں۔ وصل حاصل کرنے سے مجھے فراق کی حالت میں وصل کی خواہش زیادہ پسند ہے۔

پونگاں زمینہ مودیت چھکے مہ ہر دیا چھونی

پونگاں مکھی ہردیہ ہردیو چھومیکوت دونی

ترجمہ: تو اپنے پاؤں زمین پر نہ رکھ بلکہ تیرے قدموں کے لئے میرا دل فرش راہ ہے۔ تو قدموں کو میرے دل پر رکھ اور میرے دل میں درد کا اندازہ کر۔

زمان نے اُنکی مشہور نظم ”یارمن ہمیں“ سے مزید بند سنائے۔ اُنکی محبوبہ ”یارمن ہمیں“ کے بارے میں پُر لطف قصے سُنے شادی شدہ ”یارمن ہمیں“ کو مرزا سیار نے ایک تقریب میں دیکھا اور عشق میں مبتلا ہوا۔ ایسے کہ عشق درد بنا درد شاعری میں ڈھلا۔ شاعری عام ہوئی تو راز راز نہ رہا۔ ایک دن غصے میں ”یارمن ہمیں“ مرزا سیار کو لعن طعن کرنے شوگرام چلی موسم دُھند کھر اور ژالہ باری میں لپٹا ہوا تھا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مرزا سیار بھی محبوبہ کو ایک نظر دیکھنے ریشن کی جانب چلا۔ نکراؤ تنگ پُل پر ہوا۔ اب صورت کچھ یوں تھی کہ آگے بڑھنے میں محبوب کے جسم سے نکراؤ یعنی پیچھے پلٹنے میں محبوب کی طرف پیٹھ کرنے کی بے ادبی۔ لہذا اُلٹے پاؤں چلنا شروع کیا تو پھسلن کی وجہ سے دریا کی موجوں میں پڑا۔ تیرتا ہوا ریشن جا نکلا۔ یارمن ہمیں کے ایک ہمسائے کے گھر پناہ لی۔ اتنی سردی میں یہ حالت۔ استفسار پر جواب شعروں کی صورت میں تھا۔ بس تو یہی اشعار دل کے رازوں کو زبان زد عام کر گئے۔

ایک بار محبوبہ کا چرخہ بنانا پڑا۔ مرزا نے لکڑی کے حصول کے لیے بے شمار خوبصورت

درختوں کا قیمہ کیا۔ دھاگہ ڈوری کے لیے ہندوستان گیا۔ محبتوں چاہتوں اور جذبوں کی آمیزش سے اسے تیار کرنے میں دن نہیں مہینے نہیں سال لگائے پھر کمر پر اٹھا کر محبوبہ کو دے کر آیا۔ اور یہ سب سنتے ہوئے میں سوچتی تھی۔ بعض عورتیں کیسی بخت ور ہوتی ہیں شوہروں اور عاشقوں دونوں کو نچوڑتی ہیں۔

ساتویں پیزھی پر پہنچ کر سردار زماں کا شجرہ نسب سیار بابا سے جا جڑتا ہے۔ ”اپنے جد امجد کی طرح آپ نے بھی کوئی معرکہ مارا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے زماں کی طرف دیکھا۔ زماں کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

جب گھر واپسی ہوئی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ چنار کی چھاؤں تلے بیٹھ کر ابھی دم ہی لیا تھا کہ لوہے کی سفید پیٹ شدہ میز پر کھانا چن دیا گیا۔ مرغی کا سیاہی مائل شوربہ اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ چترالی لوگ سالن میں سُرخ مرچ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور گوشت کی بھنائی خوب کی جاتی ہے۔ سلاد کے نام پر پلیٹ میں جو سجایا گیا تھا وہ ہری دیسی پیاز کے آخری سرے جنہیں پنجابی زبان میں پھوکیں کہتے ہیں کی صورت میں موجود تھا۔ ان پھوکوں کو میں نے کم و بیش ہر چترالی گھر میں کھانے کے ساتھ کھاتے دیکھا۔ صافی میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور پلیٹ میں دہی تھا۔ دہی بنانے کا طریقہ بھی بڑا مختلف ہے۔ گھر کی سوانی کے کچے دودھ کو کسی برتن میں ڈال کر گرمی والی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔ جب وہ پھٹ جائے تب اُسے دہی بن گیا ہے خیال کیا جاتا ہے۔ سالن اپنی کالی رنگت کے باوجود نہایت لذیذ تھا۔ دہی مزیدار تھا۔ روٹی میں خستگی اور مٹھاس تھی۔ اور پھوکوں کو سلاد کے طور پر کھانا ایک نیا تجربہ تھا۔ نئے اور پرانے تجربوں سے لطف اندوز ہوئی۔

”چائے“ سردار زماں نے پوچھا۔

”چائے میں آپ کے اہل خانہ کے ساتھ آپ کے کچے گھر میں بیٹھ کر پیوں گی۔“ میں نے

ظہر کی نماز کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور جب مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ جائے نماز اندر مہمان خانے میں بچھا دیا جائے یا

باہر بھوری آنکھوں والے سردار زمان کے دس سالہ بیٹے نے اپنی بانہوں کے ہالے میں باپ کی گردن نیچی کرتے ہوئے اُسکے کانوں میں سرگوشی کی۔

باپ نے ہنستے ہوئے اچھا اچھا کہا اور گردن اسکی گرفت سے آزاد کی۔ میری مسکراتی ہوئی آنکھوں میں تجسس سا محسوس کرتے ہوئے وہ بولے۔  
 ”سری لژکا کا سکور بتا رہا تھا۔“

میرے اللہ میں ہنسی اس ذور افتادہ جگہ جہاں ابھی ٹی وی اور ڈش نہیں پہنچا چھوٹے بچے بھی کس قدر کرکٹ کریز کے مارے ہوئے ہیں۔

کمرے کے عین وسط میں جلتی آگ اسوقت بجھی ہوئی تھی پر کھانا چونکہ یہیں پکتا تھا اس لئے گرمی تھی۔ مگجے سے نمندے پر بیٹھتے ہوئے میں نے چائے کا پیالہ ہاتھوں میں تھاما۔ اوپر تلے کے بچوں والی نو عمر ماں کے طور طریقوں اور رکھ رکھاؤ میں بالعموم جو طریقہ سلیقہ ہوتا ہے وہی یہاں کارفرما تھا۔ گندے برتنوں کا ڈھیر، رضائیوں اور کپڑوں کا کھلارا۔ یہ خاتون خانہ کی راجدھانی تھی۔ زمان صاحب کا ذاتی کمرہ میں مہمان خانہ کے ساتھ دیکھ آئی تھی۔ سیلف میڈ پڑھے لکھے کوہستانی مرد نے اسکی تزئین اچھے انداز میں کی ہوئی تھی۔

”زمان میں خود بڑی بد سلیقہ اور پھوہڑ عورت ہوں۔ شرمندگی والی کوئی بات نہیں چھوٹے بچوں کے ساتھ سب چلتا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سردار زمان کی اس خواہش کے اظہار پر کہ آپ تھوڑی سی خوبانیاں اپنے ساتھ لے جائیں میرے اندر کی لالچی اور کفایت شعار عورت جیسے یکدم کھل سی اٹھی۔ چند خوبانیاں اور ایک کپ چائے۔ ناشتے کا جھنجھٹ سرے سے ختم۔ ریٹ ہاؤس میں فرج موجود ہے آسانی سے چند دن نکل سکتے ہیں بلکہ رات کا کھانا بھی گول کیا جاسکتا ہے۔

پراس کڑوی سوچ نے ساری بچتوں کے راستوں پر بند لگا دیئے کہ بوجھ اٹھانے سے پاؤں رپٹ سکتا ہے۔ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ ریٹ ہاؤس کے ملازم وہ خواہ میدانے علائے

کے ہوں یا پہاڑی ماشاء اللہ کم و بیش ایک نمبر کے چنورے اور ہیرا پھیری میں ماہر ہوتے ہیں۔  
 فرج میں رکھے مکھن انڈے ڈبل روٹیوں اور دیگر اشیاء پر دل کھول کر ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔  
 پروین عاطف کی بچتوں کی جیسے فیتی فیتی ہوئی تھی اُنکی تو میں یعنی شاہد تھی۔ میری یہ بیچاری خوبانیاں  
 تو اُنکے دو پھکوں کی مارتھیں۔

”زمان صاحب رہنے دیں۔ میں نے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتا ہے۔ ابھی ریشن  
 جاتا ہے۔ رات وہاں رہنا ہے۔ یہ پیکٹ تنگ کرے گا۔“

پر گتے کے ڈبے میں توت کے پتوں پر خوش نظر اور خوش ذائقہ خوبانیوں کو سردار زماں  
 یوں سجا رہا ہے تھے جیسے کوئی ماہر بیوٹیشن ڈلہن کو سجاتی سنوارتی ہے۔ میرے لئے اُن پہاڑوں  
 میں ان اُونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اپنے من سے بھی زیادہ وزن کے وجود کو سبک رفتاری سے اٹھائے  
 اٹھائے پھرنا ہی خاصا کٹھن کام تھا اب اس پیکٹ کو بھی تھامنا۔ میرا انکار اور انکا اصرار۔ مجھے  
 خاموش ہونا پڑا۔

سوز و کی جیپ کا پتہ کرنے جوڑ کے گاؤں گئے تھے۔ انہوں نے آ کر خبر دی کہ اس وقت  
 ایک بھی گاڑی موجود نہیں۔

”آپ موٹر بائیک پر بیٹھ جائیں گی؟“ زمان نے تذبذب سے پوچھا۔  
 ”ارے موٹر بائیک چھوڑ ریڑھی میڑھی گھوڑا گدھا خنجر سائیکل سبھوں پر بیٹھ سکتی ہوں۔  
 جو چیز آسانی سے دستیاب ہو جائے ٹھیک ہے۔“

مجھے وداع کرنے وادی کے بہت سے لوگ آگئے تھے۔ تمن بج رہے تھے۔ لان میں  
 زمان کے بیوی بچے اُسکی بہنیں بھادجیں چچیاں تائیاں سب موجود تھیں۔ میں اُنکی محبتیں سمیٹ  
 رہی تھی۔

”آپ آج رات ٹھہرتیں“ زمان نے کہا۔

”دراصل ریشن بہت بڑی وادی ہے اسکے سیرپائے میں وقت لگتا ہے۔“

ریشن میں پہلے تو خجل خواری ہوئی۔ مطلوبہ گھر جانے کہاں گم ہو گیا۔ بیچارے لڑکے کی سڑک پر چک پھیریاں شرمندہ کیے جاتی تھیں۔ بارے خدا مشکل حل ہوئی۔ اندر گئی اور دوسرتوں سے بیک وقت گلے ملی۔ گھر والی کا والہانہ انداز استقبال گھر کی دیواروں پر انگور کی بیلوں اور ان میں لگے بے حسابہ پھل کا پھیلاؤ۔ ”پروردگار“ میں نے بچوں جیسی حیرت و مسرت سے اسے دیکھا۔ گھر کے آنگن میں بچھے جہازی تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے خاتون خانہ سے سیار بابا کی محبوبہ کا پوچھا۔ انہیں تو کچھ نہیں پتہ تھا۔ انکی پڑھی لکھی بہو اور وادی کے تعلیم یافتہ چند لوگ جو ان کے بلانے پر آئے تھے سبھی لاعلم تھے۔ بس تو میں نے جانا کہ یہ سب تو حال میں زندہ ہیں اور ماضی سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ یارمن ہمیں کا گھر زمانے کی دست و برد کی نذر ہو اور کسی کو اس کا پتہ نہیں۔ چلو چھوڑو۔ ریشن کی سیر کر لیتے ہیں۔

”ریشن بہت بڑی اور خوبصورت وادی ہے۔“ چیرمین صوبیدار افسر علی شاہ نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

ریشن گول میں جرمنی کے تعاون سے بننے والا پاور ہاؤس تو بس میں نے باہر سے ہی دیکھا۔ راغین میں ہائی سکول پولو گراؤنڈ اور اسپتال کا دیدار کیا۔ ریٹ ہاؤس کی عمارت اور اسکے باغ کی سیر کی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں پوری وادی گھوم چکنے کے بعد میں نے سوچا تھا اب رات یہاں کس لیے ٹھہروں۔

جب گھر آئی خاتون خانہ چولہے کے پاس تھیں۔ مجھے انہوں نے اپنے پاس بچھے نم دے پر بٹھایا موٹی سی روٹی توے پر پکتی تھی۔ پھر اس روٹی کی سینکائی چولہے کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے کونلوں پر کی گئی۔ راکھ کو پھونکوں کے ساتھ جھاڑا گیا۔ مقامی ساختہ ڈولی سے تازہ مکھن کے پیالے سے اس پر ایک پیڑا رکھا گیا۔ میرے بچپن کا ایک جانا پہچانا منظر میری ماں اور دادی مکئی کی روٹیاں اسی انداز میں سینکتی تھیں۔

چائے کے گھونٹ کے ساتھ میں نے نوالہ مکھن میں لتھیر کر منہ میں رکھا تو جس ذائقے

سے آشنا ہوئی اُس نے بہت سی یادوں کو آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کیا۔ دوسرا نوالہ اور چائے کا دوسرا گھونٹ ابھی بھرا ہی تھا جب خاتون خانہ کے بڑے بیٹے نے باہر سے آ کر کہا۔  
A.K.R.S.P کی ایک گاڑی ہم نے روکی ہے جو چترال جا رہی ہے۔ جلدی کیجئے۔ تیسرا نوالہ منہ میں ڈالا اور چوتھا ہاتھ میں پکڑ کر باہر کی طرف دُھڑکی لگائی۔

وہ مکھن گرم روٹی کے وہ نوالے خاتون خانہ کا مجھے روک کر ماتھا چومنا اور انکی بہو فاطمہ کامیرے ہاتھوں پر ٹاپس رکھنا جیسی یادوں کے ساتھ ساتھ ایک کاش بھی ہے۔ کاش میں اُس مکھن کے ساتھ وہ پوری روٹی کھا سکتی۔

## وادی شغور۔ محل

### اور راجہ فیملی

صبح کے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تو اسی تک و تاز میں گزر گئے کہ کہیں سے کوئی مُفتتا ہاتھ لگ جائے۔ چُنیو پل کے پاس ایئر پورٹ روڈ پر پہاڑوں کی قدرتی کھوہ میں کھڑے ہو کر بہتیری گاڑیوں کو ہاتھ دیئے پر جب بات نہ بنی تو خود سے کہا۔ میاں اڈے پر چلو۔

گرم چشمے کے لئے جو گاڑی تیار تھی۔ اُسکی فرنٹ سیٹ پر مقامی عورتیں قابض تھیں پیچھے کی کھلی ہواؤں اور کھلی فضاؤں میں ڈرائیور نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے ایک گوشے میں تھوڑی سی جگہ دیتے ہوئے ایک چھوٹے سے بچے کو میرے ساتھ جوڑ دیا۔ چلو شکر ہے میں نے چادر سے چہرے کو ڈرائنگا کرتے ہوئے اپنے ہمراہیوں کو کھلے ڈھلے انداز میں دیکھا۔ پہلا تصادم تو ان دو سکھ لڑکوں سے ہوا جنہوں نے آنکھیں چارہ ہوتے ہی مجھے ”ماں جی نمستے“ کہہ کر عظمت و تقدس کے منبر پر بٹھا دیا۔ میں نے بھی اس منبر پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اُنکی یہاں موجودگی اور دیگر تفصیلات جانی چاہیں۔ افغانستان میں اُنکا کاروبار تھا۔ (یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے افغانستان ابھی بیچارہ نہیں بنا تھا) دریا م سنگھ اور بسنت سنگھ نام تھے۔ شملے سے تعلق تھا بس گھومنے پھرنے چترال نکل آئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بقیہ لوگ سیدھے سادھے مقامی تھے سوائے اُس نوجوان کے جو تعلیم یافتہ نظر آتا تھا اور میرے لئے مفید ثابت ہو سکتا تھا پر وہ ابھی اپنی تعلیم کے گھمنڈ اور ذرا لیئے دیئے کے چکر میں نظر آتا تھا۔ میں نے بھی اسکی کلف و لف اترنے کا سوچتے ہوئے انتظار کو

ترجیح دی۔

میرا پہلا پڑاؤ وادی شغور تھا جہاں مجھے کرنل راجہ مطاع الملک سے ملنا تھا۔  
 سکھ لڑکوں کی انگریزی خاصی رواں تھی۔ کاروباری سلسلے میں وسط ایشیا کی ریاستوں  
 میں آنا جانا رہتا تھا۔ نو عمری کے باوجود گفتگو میں زمانہ شناسی کی جھلک تھی۔ مشاہدے کے تجربے کا  
 عکس تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ راجہ یونیورسٹی کالہاں۔ اے پاس سلطان محمود بہت جلد گفتگو میں شامل ہو  
 گیا۔

وادی شغور تک موغ مردان پرابیگ اور دو آلہ بیس بیس پچیس پچیس دیہاتوں پر  
 مشتمل وادیاں ہیں۔ اس راستے میں تین مقام ایسے تھے کہ جو ابھی بھی حافظے میں محفوظ  
 ہیں۔ سنگ مرمر کے پہاڑوں سے پتھر نکالا جا رہا تھا۔ تازہ نکلا ہوا پتھر دھوپ کی شعاعوں میں نہاتا  
 بصارت کو قوس قزح کے رنگوں سے شاد کرنے لگا۔ ذرا آگے پہاڑوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ اس  
 درجہ پر ہیبت اور ڈراؤنا تھا کہ پل بھر کے لئے میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر گاڑی  
 ایک جگہ خراب ہو گئی۔ ان راستوں میں گاڑی کا خراب ہونا ایک یقینی امر ہے۔ سواریاں اتر  
 گئیں۔ میرے لئے ادھر ادھر کا جھانکی کے لئے موقع غنیمت تھا۔ یہاں وہاں بکھرے ہوئے  
 قدرت کے جلال کے نمائندہ مظاہر کی ثناء آنکھیں اور زبان بیک وقت کر رہے تھے۔ تنگ راستے  
 سے ذرا آگے بکدم کشادگی کا احساس ہوا۔ سڑک سے اوپر قدرے بلندی پر پہاڑوں سے گھرا ہوا  
 ایک کشادہ پتھر یلا قطعہ تھا جہاں نالے کا پانی بہہ بہہ کر نیچے سڑک کو بھگوتا دیر یائے گرم چشمے میں  
 گر رہا تھا۔ میں اوپر چڑھی بھاگتی ہوئی آگے تک گئی۔ پیاس کا احساس ہو رہا تھا۔ میٹھا ٹھنڈا شفاف  
 پانی مزے مزے سے پیتے ہوئے خاصی دیر بعد جب میں نے رُخ پھیرا میرے پورے وجود نے  
 دہشت کا ایک خوفناک جھٹکا کھایا تھا کہ میری پھٹی پھٹی آنکھیں اپنے چاروں طرف بلند و بالا  
 پہاڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ سڑک جسے میں نے آگے تک جاتے ہوئے دیکھا تھا جانے کہاں  
 تھی۔ گم سم حواس باختہ بولائی سی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی مجھے اپنے حصار میں لئے یہ کیسا طلسم کدہ

تھا کہ جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

شفاف نیلا آسمان اور اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا سورج بھی میرے دل کی دھڑکن کو قابو کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ پھر جیسے دریائے گرم چشمے کے شور مچاتے پانی نے مجھے ذرا سی ڈھارس دی میں نیچے بھاگی مجھے نشیب میں سڑک نظر آئی۔ سڑک پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی راستے کے شگاف دکھائی دیئے۔ سانس ابھی بے قابو تھا۔ پچھلی سمت بھاگی تو دور گاڑی اور لوگوں کو دیکھ کر سانس اور اعتماد دونوں بحال ہوئے۔

شغور اتری تو ماں جی کے دونوں سکھ بیٹوں نے بہت عقیدت و محبت سے اُسے پر نام کیا۔

انہیں دعائیں دیتے ہوئے میں نے اپنا گرم چشمہ جانے کا پروگرام اور سلطان محمود کی رہنمائی کی ضرورت دونوں باتیں اسکے گوش گزار کرتے ہوئے اسکی مدد چاہی۔

”حاضر سائیں“ اسنے سینے پر ہاتھ رکھا کل گیارہ بجے خاکسار گرم چشمہ روڈ پر آپکا انتظار کرے گا۔ گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی پر میں ہنوز سڑک پر کھڑی تھی۔ میرے سامنے خاصی بلندی پر جھروکوں اور بالکونیوں والی ایک ایسی عمارت تھی جسکی پور پور سے کہنہ سالی ٹپک رہی تھی جو جانے کتنے سرد گرم موسموں کے اتار چڑھاؤ کی چشیدہ تھی۔

مغل طرز تعمیر کی نمائندہ جس پر ایرانی اور کشمیری ثقافت کے رنگ غالب تھے۔

دریائے گرم چشمے کا پاٹ یہاں چوڑا تھا۔ پار جانے کے لئے پل نیا تھا مجھے پار نہیں جانا تھا پر پھر بھی میں کچھ دیر پل پر کھڑی ماحول کی رعنائی فضا کی تنہائی سے اور چند لمحوں کے لئے ہاتھ آئی آزادی اور سرشاری سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

پھر مجھے دولٹ کے نظر آئے جو اوپر سے نیچے اتر رہے تھے۔ قریب آنے پر تعارف ہوا یہ دونوں سنگین علی شاہ اور تکبیر خان تھے کراچی میں رہنے کی وجہ سے ستھری اردو بول رہے تھے۔ اب وہ بھند کہ۔۔۔ میری رہنمائی تو اسی صورت میں ہوگی جب پہلے میں انکے گھر جاؤں۔ ”چلو بابا“

اصرار اتنا شدید تھا کہ جھکنا پڑا۔ اونچے چوہی دروازے اور فصیلوں والے محل کے ہمسائے میں یہ غریبانہ گھر معاشرے کے طبقاتی نظام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پرگھر والیاں دل کی اتنی تو نگر کہ جنہیں یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ مجھے کیا کھلائیں کیا پلائیں کہاں اٹھائیں کہاں بٹھائیں۔

محل تک جانے کے لیے خاصی اونچی چڑھائی ہے۔ اس چڑھائی کے کناروں پر دورو یہ درختوں کی چھدری چھاؤں میں نہاتے ہوئے وسیع و عریض قطعے میں نیلے فیروزی رنگے اُس چوہی دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی جسکی قامت کو دیکھنے کے لئے مجھے اپنی گردن کو خم دینا پڑا تھا۔ کھڑکی نما دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دائیں بائیں نیلے ستونوں کے ساتھ زمینی فرش سے دو فٹ اونچے چوہے بنے ہوئے تھے۔ آگے باغ تھا۔ جاپانی پھل کا بڑا سا درخت کچے پھل کے ساتھ اور ناشپاتی کا درخت پکے پھل سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ کاسنی گلابی نارنجی پھولوں سے بھری چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں منظر کے حسن میں اضافے کا باعث تھیں۔

داہنے ہاتھ نیلا پینٹ شدہ چوہی محل کھڑا تھا جسکے ستون مارخور اور آئیکس کے سینگوں سے سجے تھے۔ راہداریوں سے گزرتے ہوئے لڑکے مجھے چھوٹے سے نیلے دروازے سے تنگ و تاریک بیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے آئے۔ یہ ہال کمرہ تھا۔ میں نے لمبی سانس بھری صوفے اگر ٹونے پھوٹے تھے تو کشمیری آرٹ کی چوب کاری سے مزین میزیں اور تپائیاں گرد سے اٹی پڑی تھیں۔ مضبوط لیکن بھدی دیواروں پر پڑانے فریموں میں بھی تصویریں قریب سے دیکھے جانے پر اپنے نادر ہونے کا پتہ دیتی تھیں کہ گزری ہوئی عہد ساز ہستیاں ان میں زندہ تھیں۔ لارڈ ولنگٹن، نظام حیدر آباد دکن، چیف کمشنر دہلی انکی بیگم ڈاکٹر اجیت کر، وائسرائے کونسل کے ممبران، صاحبزادہ عبدالقیوم۔

میں نے دیکھا تھا سنگین علی کی لمبی سفید انگشت شہادت ایک تصویر پر آئی۔ اسکی آنکھوں سے روشنی کی جو جوت نکل کر مجھ تک پہنچی تھی وہ محبت اور احترام کی پھوار میں بھگی ہوئی تھی۔ اس نے جب یہ کہا تھا ”ہمارا شہزادہ“ تو لہجے میں گھٹی پیار کی مٹھاس نے بے اختیار مجھے اُس تصویر کو

دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا جسے وہ اُنکلی کی پور سے دبائے کھڑا تھا۔ یہ ۱۹۴۰ء میں پونا میں فوجی وردی میں ملبوس وجہیہ نوجوان مطاع الملک تھے۔ راجگی نظام سے نوجوان نسل کی بیزاری کا شمالی علاقوں میں گھومتے پھرتے مجھے عام مشاہدہ ہوا ہے۔ مگر ”ہمارا شہزادہ“ جیسے الفاظ شہزادے کی عوام دوستی کا کچھ لمبی چوڑی تفصیل بتائے بغیر کھلا اظہار تھا۔

دیواریں نایاب خاندانی تصاویر سے سجی ہوئی تھیں۔ نیچی چھت والی اس بالکونی میں قیمتی قالین اور صوفے سب ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار تھے۔ ان کھڑکیوں سے پوری وادی شعور نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی وہ جھروکہ تھا جہاں راجہ یا مہتر (بادشاہ) کھڑے ہو کر رعایا کو دیدار کرواتا تھا۔

ملحقہ بیڈروم تھے۔ نادر قسم کے بیڈ جنکے سرہانے اور پائینتیاں منوں وزنی پیتل سے بنی تھیں۔ ہاتھی دانت کی اینٹیک میزیں۔ ریڈنگ روم جن کی الماریاں ریڈرز ڈائجسٹ، اُردو ڈائجسٹ لائف مسلم Horticulture سے بھری پڑی تھیں۔ میں نے اندرونی بالکونیوں کے گرد آلود چوبی فرش پر چلتے چلتے رک کر اس سارے منظر پر ایک حسرت زدہ نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں وقت مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ان کے ہاتھوں سے سرک گیا ہے۔ اقدار نے نئے پیرہن پہن لئے ہیں۔ انکا شاندار کل اور اُس کل میں بسر شدہ زندگی اسکے ہنگامے اور جھیلے سب قصہ یارینہ ہو چکے ہیں۔

پر کیا یہ لوگ یا سیت کا شکار ہیں۔ وقت کے اس تغیر کا خوش دلی سے سامنا کرنے سے گریزاں ہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود نہیں جانتے ہیں کہ انکا ماضی اُنکا یہ ماحول اور اس سے متعلقہ سب چیزیں تاریخی ورثہ بن گئی ہیں۔ انکی حفاظت اور دیکھ بھال جتنی اہم اور ضروری کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔

اندھیری اور شکستہ میڑھیوں سے آہستہ آہستہ اُتری۔ سنگھین اور سنگھیر نے لان میں

کھڑے ہو کر مجھے زنان خانے کا دروازہ دکھاتے ہوئے اجازت چاہی کہ اس سے آگے جانے کا  
انہیں اختیار نہیں تھا۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ یہاں ایک اور ٹوٹی پھوٹی ویران دنیا منتظر تھی۔  
پتھروں کی کوٹھڑیاں جن میں جھانکی تو گودام لگے۔ لکڑی کے ترازو پتھروں کے باٹ۔۔۔۔۔  
میرے سامنے تقریباً دس فٹ اونچی پتھروں کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اندر جھانکی  
اور پھر داخل ہوئی۔ تنگ و تاریک ستونوں والا کمرہ جسکے دروازے نیلے تھے اور کونے میں دو اٹیچی  
کیس پڑے تھے۔ اگلا کمرہ اس سے بھی تاریک تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دہل کر باہر  
بھاگی۔ باہر کیا تھا؟ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ خدایا یہاں انسان رہتے ہیں۔ پہاڑ جیسا جگرا کیا اور  
پھر اس غار میں داخل ہوئی۔ دونوں کمروں کا پل صراط جیسے تیسے پار کیا۔ ”میرے خدایا“ آگے  
پھر ایک لمبا اور تاریک کمرہ تھا۔ یقیناً مجھے اس وقت لوئیس کیروں کی ایلیس یاد آئی تھی۔ بلاشبہ میں  
ایلیس نہیں تھی پر بخدا میری کیفیت ایلیس سے کم نہیں تھی۔ جو آنکھیں بند کئے تجسس اور شوق کے  
ہاتھوں سیاحت کے خرگوش کے تعاقب میں اندھیروں کی ان سرنگوں میں گر پڑی تھی۔ ساری ہمت  
حوصلہ اور دلیری اڑ چھو ہونے لگی۔ پھر جیسے اندھیرے کے اس غار میں مجھے آخری سرے سے  
روشنی کی ایک کرن سی دکھائی دی میں دیوانہ وار اسکی طرف بھاگی۔

میرے سامنے ایک دل کشا منظر تھا۔ رنگارنگ خوشنما پھولوں کی رعنائی تھمیلین گھاس  
سے سجے لان کی دلربائی اور قدیم و جدید عمارتوں کی زیبائی۔ داہنے ہاتھ چترالی کمرے اور  
برآمدے تھے۔ برآمدے چترالی تخت قالین اور گاؤ تکیوں سے آراستہ تھے۔ سامنے شیشے کی  
کھڑکیوں اور جالیدار دروازوں والی جدید عمارت تھی جس کے برآمدے مارخور کے سینگوں اور  
پھولوں سے سجے تھے۔ جس کمرے کی دلہیز پر میں جا کر کھڑی ہوئی وہ چترالیوں کی زبان میں  
پاپٹس (نشست گاہ) کہلاتا ہے۔ باہر کی فضا پر جو سناٹا اور ویرانی میں نے دیکھی تھی۔ راہدار یوں  
کے کمروں میں جو اندھیرا خوف اور دہشت میں نے محسوس کی تھی اسکے برعکس یہ کشادہ کمرہ زندگی کی

حرارت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ نوجوان خوبصورت اور نونیز لڑکیاں ایک دائرے کی صورت میں ایک بوڑھے مرد کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

کرنل مطاع الملک کی جوانی کی تصویروں سے میری اتنی شناسائی تھی کہ بڑھاپے میں انہیں لت پت دیکھ کر بھی میرے دل نے جیسے سرگوشی کی کہ یہی ہے وہ ملتان کی جنگ آزادی کے لیے جوانمردی سے لڑنے والا مجاہد۔

دوپہر کے کھانے کے لئے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ خادما میں کھانے کی سروس میں مصروف تھیں تعارف کا مرحلہ بہت مختصر تھا۔ مجھے خوش ہوئی وہ مجھے اردو ڈائجسٹ کے حوالے سے جانتے تھے۔

”آئیے پہلے کھانا۔“ معزز میزبان سراپہ شفقت تھے۔ میں نے بھی بسم اللہ کہتے ہوئے ہاتھ دھوئے اور پلیٹ میں ابلے چاول ڈال لیے چاولوں کو پُرانے دیسی گھی کا مس لگا ہوا تھا۔ ہم ڈالڈا اور برائکر مرغیوں کے پروردہ دیسی گھی اور کھال والی دیسی مرغی کی لذتوں سے نا آشنا۔ کہیں بچپن میں جب زمانہ خالص تھا ان سے تھوڑی بہت شناسائی ہوئی ہوگی پر بچپن کی شناسائیاں کم ہی یاد رہتی ہیں۔ اور بڑے لوگوں کی حکیمانہ باتوں کہ کھال میں غذائیت ہوتی ہے کی کون پرواہ کرتا ہے کہ بچے بالے بوڑھے جوان سب چسکوں اور صواد کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں۔

کٹور خاندان کے اس شاہزادے نے جونہی اپنی خاندانی اور ذاتی کتاب کو کھولا میں شوق سے اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

چترال کی تاریخ میں انکے والد ہزبائی نس سر شجاع الملک اور ان کے بھائی سر ناصر الملک رفاہ عامہ کے کاموں سے اپنی لگن۔ ریاست کے بے کس نادار اور فقیر حال لوگوں کے لئے خذراہ۔ تعلیم یافتہ مدبر سیاستدان۔ بہترین منتظم اور ایک کامیاب ڈپلومیٹ کے طور پر زندہ ہیں۔ ناصر الملک تو بڑی ہی انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اچھے شاعر اور شاہ

غریباں کے نام سے اپنے لوگوں میں مشہور تھے۔ ان کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیم اور تعلیمی اداروں کا پھیلاؤ تھا۔ چترال میں ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ان کے الفاظ تاریخ میں محفوظ ہیں۔

”یہ ادارہ ایک بم کی صورت ہے جو ایک دن پھٹ کر میرے محل کی دیواروں کو گرا کر اُن برائیوں کا خاتمہ کر دے گا جو زمانوں سے ہمارے راجگی نظام کا حصہ ہیں۔“

دور افتادہ دشوار گزار راستوں والی یہ ریاست قیام پاکستان سے قبل اپنے حمیدہ اوصاف مہتروں کی وجہ سے انگلینڈ سے لے کر چین تک متعارف تھی۔

کرنل مطاع الملک نے ابتدائی تعلیم چترال پھر رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون سے حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں انڈین آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور ۱۹۴۱ء میں سنگاپور میں بطور کیپٹن کام کیا دوسری جنگ عظیم میں ملائیشیا کے مختلف محاذوں پر داد شجاعت دی۔ جاپان میں قیدی بھی رہے یہ اور بات تھی کہ رائل فیملی سے تعلق کا علم ہونے پر جاپانیوں نے اچھا سلوک کیا۔ مشرق بعید کے تقریباً سبھی ملکوں میں انہوں نے اپنے وقت کا تھوڑا تھوڑا حصہ گزارا۔ ۱۹۴۸ء میں ملتان میں پندرہ ماہ تک بغیر کسی تنخواہ اور معاوضے کے اسکی جنگ آزادی لڑی۔

چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑ کر میں نے کمرے پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی اس میں موجود قیمتی فانوس، قالین، دیواروں پر لگی تصاویر، آتش دان اُن پر سجے نوادرات، بزر چوہی ڈیزائن دارستون سب گورا جگی کروفر کو نمایاں کرتے تھے پروہیں ان پر چھائی بوسیدگی اس نظام اور متعلقہ افراد کو رو بہ زوال بھی ظاہر کر رہی تھی۔

خادمہ نے انکا خاندانی البم میرے ہاتھوں میں تھپایا۔ ان کے بچپن اور جوانی کے عکس کہیں ہائیکنگ کہیں رائیڈنگ کہیں پولو کھیلتے ہوئے۔ کہیں برجس پہنے شیروں کا شکار کرتے ہوئے کہیں ملائی بیوی کہیں چترالی بیوی کہیں چینی بیوی کے ساتھ۔ ماشا اللہ اس میدان میں بھی جھنڈے گاڑے بیٹھے تھے۔ انکی بارعب شخصیت کے بے شمار پہلو اس طرح دارحسینہ کی طرح میرے

سامنے آرہے تھے جو رنگ رنگیلے جوڑوں، بالوں کے نت نئے سائل اور وجود کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہر بار ایک نئی صورت کو جنم دیتی ہے۔

پھر جب انکی پیشکش پر محل کا بقیہ حصہ دیکھنے کے لئے انکی بہوؤں اور ان کے ساتھ باہر آئی میں نے سہ پہر کو شکستہ دیوار پر عجیب یا سیت بھرے رنگ میں ڈھلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اور جب پرانے محل کے مہمان خانے، خادموں کے کمرے، کٹنس (غلہ رکھنے کی جگہ) اور سنوردیکھتے ہوئے راتھنی میں داخل ہوئی وہاں موجود بوڑھی خادماؤں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی اُس کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا وہ یقیناً میرے لئے حیرت و استعجاب کے ساتھ ساتھ دکھ کا عنصر لئے ہوئے بھی تھا۔ نوجوان لڑکی انکی بیوی تھی۔ کمال ضبط سے میں نے اپنے اوپر وارد ہونے والی اس حیرت اور دکھ کو قابو کیا۔ پر جانے میرے اندر ابال سا کیوں اٹھنے لگا تھا پھر یہ ایک خوفناک سوال کی صورت سرگوشی کے انداز میں صاحب خانہ کی بڑی بہو کے کان میں الٹ گیا۔ ”عمر وں کے اس تفاوت میں ازدواجی حقوق کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟“ سعادت مند بہو نے مجھے قائل کرنے کی بہتری کوشش کی مارے مردت کے میری زبان گو بند تھی۔ پر چہرہ مکمل حالت نفی میں تھا شاید اسی لیے مسز حیدر نے کہنا ضروری سمجھا ”یہاں کے صاحب ثروت لوگ کم عمر لڑکی سے شادی رواجاً بھی کرتے ہیں۔“

میں ہنسی ”چلیئے یہاں کا تو شاید کلچر ہو۔ پر ماشا اللہ باقی جگہوں کے اونچے اور دولت مند لوگوں کا بھی یہی وطیرہ ہے۔ دنیا کے ہر خطے کے مرد کی عورت کی نوخیزی کے معاملے میں ہمیشہ رال چکتی ہے۔“

سامنے پتھروں سے بنا کشادہ سائینہ تھا جسکے نو دس پوڑے چڑھ کر باغ دیکھنے جانا تھا۔ جب اوپر پہنچی تو بلا مبالغہ یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ باغ کیا تھا بہشت بریں کا ایک مناسا گوشہ تھا۔ سچی بات ہے میں دم سادھے ہوئے تھی۔ سامنے دور تک سبز تملین گھاس کا میدان جسکے عقب میں پہاڑ خاموش سنتریوں کی طرح گویا اس کی حفاظت پر مامور کھڑے تھے۔ دودھ کی نہریں ریلے پھل اور

حوریں جنت کی یہ نشانیاں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سفر میں ازبر ہو چکی تھیں۔ سیموں کے بار سے ٹہنیاں جھکی پڑ رہی تھیں۔ زردے رنگی خوبانیاں سبز پتوں میں یوں چمک رہی تھیں جیسے درختوں کی شاخوں میں سجے پیلے برقی قمقمے۔ آلو بخارا منہ میں جانے کے لئے بے تاب۔ کہیں دور پہاڑوں کے سینے سے آتا آوریٹ نالہ جس کا جھاگ اڑاتا پانی دودھ کی نہر کی من و عن تصویر پیش کرتا تھا۔ تازہ دم گلاب کے پھولوں کی قطاریں جیسے میری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اترتی جا رہی تھیں۔

”گل قدان پھولوں سے بنتی ہے انکی منجھلی بہونے میری توجہ پھولوں کی ایک اور لدی پھندی کیاری کی طرف منعطف کی۔ یہ Weeping willows ہیں اور یہ۔“

“Snow ball

پھولوں پھولوں اور درختوں کے یہ رنگ۔ اس پر اس گھر کی خوش لباس اور حسین عورتیں جو یقیناً حوروں سے کم نہیں تھیں۔ یہ منظر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھنے والا نہیں تھا پر میں کتنی دیر رک کر اسے خود میں جذب کر سکتی تھی۔ وقت نے اپنے شکنجے میں کسی ظالم اور جابر شوہر کی طرح جکڑا ہوا تھا اور فرصت زندگی سے سکون کی طرح عنقا تھی۔ میرا زکنا کس قدر دشوار تھا۔

چائے تو یونہی کمرے میں پی۔

جانے سلونی شام کے اس دلفریب ماحول میں چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر نگاہوں میں نظاروں کو سمو کر اسے گھونٹ گھونٹ پینا مجھے اتنی بڑی عیاشی نظر آئی کہ جسے پورا کرنے کی ہڑک نے مضطرب سا کر دیا۔ بھلا ہو وقار الملک کی دلہن کا کہ جس نے بات گویا ہونٹوں سے ہی اچک لی۔

پلدر کے درختوں تلے بیٹھی خوش گاؤ نے تیزی سے اترتی شام کے قدموں کی آہٹوں کو سنتے ہوئے آوازیں نکال کر اپنے مالک کو بلانا شروع کر دیا تھا۔ پرندوں کی ڈاریں آسمان کے سینے پر واپسی کے لئے محو پرواز ہو گئی تھیں۔ اور جب میں بوجھل دل کے ساتھ نیچے اتر رہی تھی تو

دینیم ڈیوس کی Leisure حافظے کے کسی کونے کھدے سے اپنے اوپر پڑا ملبہ ہٹاتی میرے ہونٹوں پر آ کر تھرکنے لگی تھی۔

No time to stand beneath the boughs  
And stare as long as sheep or cows  
No time to see when woods we pass  
Streams full of stars, like skies at night  
We have no time to stand and stare.

چوپل پر اتر کر میں نے دینیم روڈ پر واقع تنور سے گرم روٹی خریدی کمرے میں آ کر نہائی۔ چائے اور مکھن کے ساتھ روٹی کھائی۔ جالی والے دروازوں کی کنڈیاں چڑھائیں۔ دینیم کے اس چار کمروں والے ریٹ ہاؤس میں اس وقت خدا میں اور چوکیدار تھے۔ نماز کے بعد بیڈ پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سچا مولا سائیں جسکی کرسی آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہتوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ چوکیدار شریف النفس انسان ہے اور چترالی عزتوں کے رکھوالے صاحب ایمان لوگ ہیں۔ پھر بھلا مجھے گہری نیند کیوں نہ آتی۔



## گرم چشمہ۔ موٹروے لواری ٹنل

### اور بدخشانی گھرانہ

اب ایسا تو ہونا ہی تھا۔ جب بندے کے مقدر میں صبح دیر تک سونے کی عیاشی نہ ہو۔ اسکی آنکھ اذان کی آواز کے ساتھ کسی میکانکی عمل کی طرح کھلنے کی عادی ہو۔ صبح کا غسل بھی خرافات میں شمار ہو۔ کپڑے لٹے کا چناؤ انکی استری میچنگ جوتے اور کسی جیولری کے انتخاب کی دوسری کا کوئی چکر سرے سے ہی نہ ہو۔ ناشتہ بھی جو مل گیا غنیمت کے زمرے میں شمار ہو تو پھر وقت کی افراط تو ہوتی ہی ہے۔ اب گرم چشمے پر جانے کے لئے سویرے ہی نکل نہ کھڑی ہوتی تو اور کیا کرتی۔ گاڑی بھی ایسی ملی جس نے اگلے پچھلے سارے دھونے دھو ڈالے۔ بگٹٹ بھاگتی گئی۔

گرم چشمہ چترال شہر کے شمال مغرب میں تقریباً ۲۷ میل کے فاصلے پر ہے۔ میں یہاں سلفر کے ان گرم چشموں کو دیکھنے آئی تھی جو جلدی بیماریوں کی شفا کے لئے عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ تحصیل لنگوہ کی یہ مرکزی وادی ہے یہیں سے ایک راستہ افغانستان کے اہم شہر بدخشاں کو درہ ذوراء کے ذریعے جاتا ہے۔ سطح سمندر سے اسکی بلندی کوئی چھ ہزار فٹ ہے۔

اس وقت ابھی آٹھ بجے تھے جب اڈہ پیروں تلے آ گیا۔ اُس پہے بندے سے تو وقت ملاقات گیارہ بجے طے تھی۔ لہذا سوچا کہ اکیلے مٹرگشت کی جائے۔

گرم چشمہ بازار خاصا بڑا اور جج دھج والا تھا۔ پختہ سڑک پر دور دور یہ بڑے بڑے دروازوں والی دوکانوں پر دوکاندار مستعد بیٹھے تھے۔ صد شکر کہ چترالی سویرے جاگنے اور کام کرنے

کے عادی ہیں وگرنہ اگر لاہور شہر والا معاملہ ہوتا تو میں اس وقت اُلوہی بند دوکانوں کو گھور رہی ہوتی۔ بازار میں کئی جگہ قیمتی پتھروں سے بچی دوکانیں نظر آئیں۔ افغانستان کے راستے زمینی رابطے کی وجہ سے یہ وادی قیمتی پتھروں کی مارکیٹ ہے۔ میرے قدم خود بخود ایک دوکان کی طرف اٹھنے لگے۔ پتھروں کی اس دنیا سے مجھے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا آخر حرج کیا ہے۔ وقت بھی ہے مواقع بھی ہیں تو کیوں نہ ان سے راہ و رسم بڑھائی جائے چار اہباب کی محفل میں بیٹھ کر ان پر ہونے والی گفتگو میں چہرے پر ناواقفیت کی چھاپ کی نمائش کا اظہار کیا ضروری ہے۔ بندہ کچھ بول کر ثابت تو کرے کہ وہ خیر سے لوئر مل کلاسیا نہیں۔ ہیروں جواہرات سے اسکی خاندانی شناسائی ہے۔ اپنی طرف سے بہتری تیزی دکھانی چاہی۔ پتھروں سے جان کاری کا تاثر دینا چاہا۔ اسکے اصلی مال کو نقلی ثابت کرنا چاہا۔ پر دوکاندار بھی بڑا کایاں تھا۔ بھڑک اٹھا۔

”خوچہ بی بی تم کچھ نہیں خریدو گی تم کو کچھ نہیں مالوم۔“

اسکی دونوں باتیں سو فیصد درست تھیں۔ لہذا مزید طبع آزمائی فضول سمجھی۔ بازار میں ہونٹوں کے اندر چار پائے والے بڑے بڑے تختوں پر لوگ بیٹھے ناشتہ کرتے تھے۔ ان میں افغانیوں کی اکثریت تھی۔ قہوے کی پھیلی خوشبو ایک پیالی کی ترغیب تو دیتی تھی پر اسے پیا کیسے جاتا روایتی کوہستانی مردوں کا ہجوم اس خواہش کی تکمیل میں مانع تھا۔

حبیب بینک۔ حبیب بینک کا انڈسٹریل سکول۔

بازار کی سیر مکمل ہوئی۔

دریائے گرم چشمہ درمیان میں بہتا ہے۔ ایک طرف بازار اور دوسری طرف وادی کے رہائشی گھر۔ نگاہوں کا افقی حدوں پر نیلے شفاف آسمان نیچے پہاڑوں پر اُگے سرسبز درختوں اور ڈھلانوں پر بنے ٹین کی چھتوں والے گھروں سے لکراؤ کے بعد انکارخ دریائے گرم چشمہ کے جھاگ اڑاتے پانیوں سے ہوتا ہے۔ اس منظر میں بہت دلکشی ہے۔

گرم چشمہ کے لئے چلنا شروع کیا تو چلتی چلی گئی۔ اونچے نیچے میڑھے میڑھے

راستوں کے بعد کھلے میدانوں کو پار کیا پھر کہیں جا کر اس کا دیدار ہوا۔ ایک بڑے سے کمرے میں چند باتھ روم بنائے ہوئے تھے۔ ان باتھ روموں میں چشموں سے پاپیوں کے ذریعے پانی آتا تھا۔ غسل کرنے والے حضرات کو غسل کے بعد کمرے میں اوڑھایا جاتا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ زونخ کی جھاڑیوں اور جنگلی گھاس سے اٹا پڑا اونچا نیچا بے ربط میدان جس میں تین چار گز لمبی سیمنٹ کی مستطیل کم گہری ہوزریاں بنی ہوئی تھیں اونچائی والی ہوزریوں سے پانی آنے کی مقدار خاصی تیز تھی جبکہ بقیہ میں پانی رس رس کر آ رہا تھا۔ پہلا دھچکہ تو اس تصور کو لگا کہ جس نے ذہن میں اسکی صورت گری ایک آبشار کی شکل میں بنا رکھی تھی۔ اس پانی کا منبع تو ظاہر ہے پہاڑ ہی تھے۔ پر زمین میں یہ کہاں کہاں سے پھوٹ رہا تھا اسکا علم مجھے بسیار کوشش کے بھی نہ معلوم ہو سکا۔ ارد گرد کوئی نظر بھی نہ آیا کہ اسی سے کچھ پوچھتی۔

الحمد للہ کہ مجھے کوئی جلدی بیماری نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر گئے گوڈوں کلائیوں کے جوڑوں میں درد تو ہوتا رہتا ہے۔ لہذا ان ہوزریوں کے ساتھ ساتھ بنی سیمنٹ کی لمبی لمبی سلیمپوں میں سے ایک پر بیٹھ کر ہاتھوں اور پاؤں کو ہوزری کے پانی میں ڈوب دینے اور انہیں گیلا کر کے چشمہ پر آ کر غسل صحت لینے والوں میں مجھے اپنے نام کا اندراج کروانا بے حد ضروری محسوس ہوا۔ اس بے حد اہم کام سے فارغ ہو کر میں نے پتھروں اور شہتروں سے بنی دیوار کے قریب جا کر دوسری طرف جھانکا میرے سامنے ایک جذباتی اور رقت آمیز منظر تھا جو بڑھاپے کے باوجود زندگی سے حد درجہ پیار کا غماز تھا۔ پانی سے لبالب بھری ہوزری کے پاس قبلہ رو کھڑا ایک بوڑھا مرد کمر کے نچلے حصے پر چھوٹا سا کپڑا لپیٹے گڑوی سے اپنے جسم پر پانی ڈالتے ہوئے اپنے خدا سے ہم کلام تھا۔

”میرے مولا بہت دور سے آیا ہوں۔ بہت مصیبت اٹھا کر آیا ہوں۔ بہت تکلیف

میں ہوں۔ تیرا نام لے کر پانی جسم پر ڈال رہا ہوں۔ مجھے شفا ہو شفا ہو شفا ہو۔“

گڑوی بھر کرتن پر اٹھ بیٹا اور شفا شفا کا نعرہ لگاتا۔

گرم چشمہ اپنی ادنیٰ پٹی کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ بازار میں ایک دوکان میں لٹکے چوغوں نے جب مجھے متوجہ کیا اور میں نے اندر جا کر انہیں ہاتھوں سے چھو کر دیکھا۔ اُن پر کیا گیا اُون اور چرمہ کاری کا کام بہت چھب دے رہا تھا۔ کتنے کا ہے؟ یہ پوچھنے اور پھر قیمت کی زیادتی اور خاصا مہنگا جیسے میرے تبصرے پر دوکاندار نے کہا۔ یہ گھریلو کھڈیوں پر بنتا ہے۔ دقت طلب دھلائی کے بعد اس پر کڑھائی کی جاتی ہے۔ محنت اور وقت دونوں اس پر بہت خرچ ہوتے ہیں۔ قیمت تو ہونی ہی ہے۔

اب جب اس گندھک طے صحت بخش پانی سے میں نے خود کو اور دوسروں کو غسل لیتے اور دیتے دیکھ لیا تو آگے بڑھی۔ یہاں پٹی کا پورا دھوبی گھاٹ نظر آیا۔ پانی کو ستور کرنے کے لئے لمبی چوڑی ہوزریاں سینٹ کی سلیمیں اور دھلائی کے لئے بڑے بڑے پختہ فرش تھے۔ کہیں پٹی کو صابن لگ رہا تھا۔ کہیں اُسے پاؤں سے مسلا جا رہا تھا۔ کہیں سکھانے کا عمل جاری تھا۔

دھوپ کی تیزی نے محویت کو توڑ کر کچھ احساس دلایا۔ وقت جاننا چاہا۔ اپنی تو ساری زندگی گھڑی کے بغیر ہی گزری۔ صد شکر کہ وہاں موجود بہت سی کلائیاں اس زیور سے آراستہ تھیں۔ اب بھانگم دوڑ شروع ہوئی۔ مطلوبہ جگہ پہنچی حسب وعدہ سلطان محمود منتظر تھا۔

گرم چشمہ خاصی کشادہ اور ترقی یافتہ وادی ہے۔ ہیلتھ سنٹر، ہائی سکول، ٹیکنیکل سکولز، بینک، نجی سطح پر کوآپریٹو بینک۔

خدا جانے یہ سلفر طے پانی سے پاؤں کو دھونے کی مسجائی کا اعجاز تھا یا وادی کی زمین کے نیچے گندھک والی چٹانوں کی کوئی کرشمہ سازی تھی کہ پاؤں ٹوٹی پھوٹی اونچی نیچی چڑھائیوں اُترائیوں میں ڈاک کے تازہ دم گھوڑے کی طرح مستعد رہے۔ دریائے ڈیرہ اور دریائے بگوشٹ کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھا۔ چلتے چلتے ایک چھوٹے سے گھر کے کھلے دروازے سے بجلی کے کوندے کی طرح لپکتا ہوا ایک ایسا منظر سامنے آیا جس نے بڑھتے قدموں کو یوں روکا جیسے آگے

کوئی گہری خوفناک کھائی ہو۔

اندر جانے کی خواہش اتنی منہ زور اور شدید تھی کہ اُسے قدموں کو ہچکچانے کا موقع ہی نہ دیا۔ کسی شتر بے مہار جانور کی طرح جو منہ اٹھائے بغیر سوچے سمجھے بھرے ہڈے کسی کھیت کھلیان میں داخل ہو جاتا ہے میں نے بغیر کسی کی اجازت کے اپنے آپ اپنے اوپر آنگن کے پٹ کھول لیے تھے۔ لپا پتا صحن جس کے ایک کونے میں اُگے توت کے درخت تلے دس بارہ سال کا خوش شکل لڑکا بیٹھا تھا۔

را تھینی میں چولہا لپا پتا تھا۔ زمین سے دو فٹ اونچی دیوار میں بنی لکڑی کی پڑھتھتیوں پر قطار در قطار سجے ایلومینم اور ستے سلور کے برتن بتا رہے تھے کہ انہیں کس لگن اور پریت سے مانجھا گیا ہے۔ دیواریں کمرے میں کھانا پکنے کے باوجود بھی میلی نہ تھیں۔ چوہی کوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی نہ تھا پر پھر بھی یہ بھرا بھرا پڑ رونق لگ رہا تھا۔ چولہے سے ایک فٹ پرے لکڑی کے ڈنڈوں پر مثلث کی صورت میں ایک کھڈی بنی ہوئی تھی جس پر سیاہی مائل پٹی کا کپڑا بن رہا تھا۔ یہ کیسا کمرہ تھا جس پر چھائے ہوئے سلیقے صفائی نفاست چھوٹی چھوٹی چیزوں کے رکھ رکھاؤ نے غریبی کے احساس کو کہیں دور چھپا ڈالا تھا۔ کمرے میں ایک تنکے کی بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ میں کہ سدا کی پھو ہڑاُن ہاتھوں کی آشیر باد چاہتی تھی جنہوں نے اس چھوٹے سے کمرے کو جاذب نظر اور قابل دید بنایا ہوا تھا پر خاتون خانہ تو کسی بیمار کی عیادت کے لئے گئی ہوئی تھیں اور گھر میں موجود بارہ تیرہ سال کا خوش شکل لڑکا ہی سوال جواب کے لئے میسر تھا۔ لہذا اسی نے بتایا تھا کہ گھر کا ہر فرد جب اور جس وقت وہ فارغ ہو کپڑا بناتا ہے۔ چوہی مثلث کی ساخت عجیب سی تھی پر جب لڑکے نے اسے مہارت سے تانے بانے میں سے گزارا تو ماننا پڑا کہ انسانی ذہن اپنے ماحول کے مطابق اختراع اور ایجاد کرتا ہے تیار شدہ کپڑا لٹک کر نیچے ایک ڈھیر کی صورت پڑا تھا۔ یقیناً کمرے کی واحد یہ چیز ایسی تھی جسے کسی حد تک بے ترتیبی کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا تھا۔

پھر سر راہ چلتے چلتے ایک اور منظر دیکھنے کو ملا۔ آفرین ہے تجھ پر اے عورت تو نے

کائنات کو خسن اور رنگ و روپ ہی نہیں دیا دھرتی کے دکھوں کا بوجھ بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر اسے ہلکا کرنے کی ٹنگ و دو بھی کی۔

کیسا چاند چہرہ تھا۔ کبھی رخساروں پر گلاب کھلتے ہوئے نگے یقیناً آنکھوں میں ستارے چمکتے تھے کہ انکی سحر زدہ سی چمک ابھی بھی موجود تھی۔ میں نے لا پرواہی سے اوڑھی چادر کے نیچے سے اُن سنہری مینڈھیوں کو دیکھا تھا۔ کبھی ان پر سونے کا گمان ہوتا ہوگا۔ زمانے کے دکھوں اور غموں نے چہرے اور وجود پر اپنے نمایاں اثرات چھوڑے ہوئے تھے پر پھر بھی اس چہرے میں کیسی گھائل کر دینے والی دلفریبی تھی کہ بندہ چہرے پر سے آنکھیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے پاس بیٹھے کھیل رہے تھے۔

کمرے میں گاڑے لے مستطیل اڈے پر سفید پٹی بن رہی تھی۔

بیٹا نیچے میدانوں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ بیسواہ مند اور بہودونوں کے ڈھیر سارے بچوں کے بوجھ کو اٹھائے وہ صبر و شکر کا پیالہ تھا مے زندگی کی گاڑی کو دھکیل رہی تھی۔

اسوقت میرا سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چلتا تھا کہ خود کو مضبوط عورت ثابت کرنے کی کوشش میں بغیر ر کے بغیر ستائے چڑھائیاں چڑھتی گئی اسوقت سلطان محمود کی عزیزہ کے گھر کے برآمدے میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ بوڑھے سینے کی ہڈیوں میں محفوظ دل آخر اتنا پریشور کیونکر برداشت کرے گا۔ اب اس عمر میں جوانوں جیسی مہم جوئی دل کے لئے سم قاتل ہی ہو سکتی ہے۔ پر میرا دل بھی بڑا مضبوط اور ڈھیٹ نکلا۔ پھر پھڑا کر بالآخر اعتدال پر آ گیا۔ کھال والی مرغی کے شور بے میں روٹی کا ٹکڑا بھگو کر اُسے منہ تک لے جاتے ہوئے میری آنکھوں نے کھڑکی سے دور نیچے کا منظر دیکھا جہاں دھوپ کی جوانی اور وادی پر پھیلے گہرے سبزے کی رعنائی چھیاں ڈال رہی تھیں۔

شام کی چائے میں نے جس گھر میں پی اُس کے اباؤ اجداد نے زمانوں پہلے بدخشاں سے ہجرت کی اور چترال میں آ کر ڈیرے ڈالے۔ بڑا دریا دل اور شائستہ اطوار کا حامل گھرانہ تھا۔

کاروباری لوگ تھے۔ اردو سمجھنے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک بول بھی لیتے تھے۔

حسن کے اعتبار سے رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ان میں انفرادیت تھی۔ ان کی نسل کے لوگوں کی اکثریت ششی کوہ میں آباد ہیں۔ کچھ چترال خاص میں اور کچھ دوسری وادیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان بدخشی لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے جانے مجھے بدخشاں کی ہڑک کیوں اٹھنے لگی تھی۔ اس تاریخی رومانیت والے شہر کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے میں نے لب کھولے ہی تھے کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے انکی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ معمر مرد نے کہا۔

”دراصل اسلام آباد کے حکمران ٹولے کو چترال کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں لواری

مثل ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

میں ہنس پڑی۔ ”بھئی چترال خصوصیت سے کیوں؟ حکمرانوں کو ملک سے ہی کوئی

دلچسپی نہیں۔ ملک جائے بھاڑ میں اور لوگ جائیں جہنم میں بس انکے معاملات ٹھیک رہیں۔“

۱۹۹۰ء میں پاکستان کو سنٹرل ایشیا سے ملانے کے لئے براستہ گرم چشمہ تا جکستان تک سروے ہوا۔ اس مختصر ترین روٹ کے لئے چیو پل سے تا جکستان تک تین سو کلومیٹر لمبی سڑک کے لئے سروے پڑھائی کروڑ خرچ ہو اقدیم ترین راستہ بھی یہی تھا۔ چترالی اتنے سادہ اور معصوم لوگ کہ انہوں نے اپنے دروازوں پر معاشی انقلاب کی دستکیں سننی شروع کر دیں۔ بڑے بڑے خواب بننے شروع کر دیئے لیکن ادھر گورنمنٹ ختم ادھر منصوبہ ختم۔

بے نظیر جب ۷ جولائی ۱۹۹۴ء میں شندھور آئیں تب انہوں نے اس روڈ کو بنانے کا

اعلان کیا۔ مگر وائے حسرت کہ یہ اعلان اعلان ہی رہا۔ اسلام آباد پہنچ کر انہیں یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ وہ اہل چترال کو کیسے ذل خوش کن خواب دکھا کر تالیاں بجوا کر آئی ہیں۔

سلطان محمود نے چائے کا مگ واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”قدرت نے چترال کو قدرتی وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے۔ کاش کوئی حکومت اس

نیچ پر کام کرے۔ بجلی کی فراہمی میں یہ علاقہ پورے ملک کو خود کفیل کر سکتا ہے۔ ایسے مقام جہاں

پانی کا بہاؤ بہت تیز اور فال ٹھیک ہے وہاں چھوٹے بجلی گھر بنا کر انہیں بڑے گرڈ اسٹیشنوں سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ حکومت بڑے سکیل پر یہ کام کرے تو اس سے ملک میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال A.K.R.S.P والوں کی ہے جنہوں نے مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پن بجلی گھر بنائے ہیں جنہیں مقامی آبادیاں خود opertae کرتی ہیں۔“

باہر رات تاریک تھی گھمبیر سناٹے کو چیرتی پہاڑی نالے کی آوازیں تھیں یا پھر وادی کے اس متوسط خاندان کی اُس لڑکی کی آواز تھی جو فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کی سٹوڈنٹ تھی۔

کہیں اگر ایسا ہو ہمارے وزیر اعظم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ چترال آئے ہوئے ہوں اچانک موسم کی خرابی لواری ٹاپ کو بند کر دے۔ فضائی سروس معطل ہو جائے اور وادی سے باہر نکلنے کے سارے راستے مسدود ہو جائیں۔ ایسے میں انہیں اپنے کسی بہت پیارے کی کوئی بُری خبر ملے۔ انکی آنکھیں آسمان کی سمت موسم کے جائزے کے لئے بار بار اٹھیں تب یقیناً ہمارے اس لیڈر کو اُس آگ کی تپش کا اندازہ ہوگا جس میں ہم اسوقت جلتے ہیں۔ جب ہنگامی حالات میں ہمارے عزیز ہمارے پاس یا ہم اُنکے پاس پہنچ نہیں پاتے جب جنازے انتظار کرتے ہیں کہ کب پیارے آ کر انہیں کندھا دیں اور لحد میں اتاریں۔ جب جگر گوشے ہمارے سگے بیمار ہوں اور ہمیں بازار سے دو امیں نہ ملیں جب ڈاکٹر ہمیں انہیں پشاور لے جانے کا کہیں اور ہم لے جانے پائیں۔ یہ فیملی گزشتہ جنوری ایک بڑے لمبے سے دوچار ہوئی تھی۔ خاص چترالی کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے ساری فیملی کا دکھ آنکھوں کے راستے باہر آ رہا تھا۔

پھر شاید ایسا ہو چترال سے اڑتے وقت وہ ہمیں یہ مژدہ سنا جائیں کہ اے اہل چترال تمہارے آلام و مصائب کے دن تمام ہوئے۔ تمہیں نوید ہو کہ میں تمہارے لئے لواری ٹنل بنا رہا ہوں۔

اس اتنی مغموم سی فضا میں اس معصومانہ انتقامی خواہش نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا

تھا۔

گھر کے بڑے بیٹے نے میری طرف دیکھا اور ہنس کر بولا۔

”کتنی احمق ہے یہ۔ ارے بھولی بادشاہ وہ تو چپکتے دکتے رنگ برنگے حسن و نور سے

بھرے پرے دنوں میں بھی ہمارے پاس نہیں آتے۔ خراب موسموں میں بھلا کیوں آئیں گے۔

اور اگر کبھی بھولے بھٹکوں سے آ بھی جائیں تو طلسمی کھٹولا ڈول ڈالکر انہیں اور انکے موالیوں کو اڑا

لے جائیگا۔ اور یہ دیکھتی رہ جائے گی۔“

میں اس دکھ اور کرب کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی جو اسکے اندر سے گرم لاوے کی طرح

نکل کر مجھے جلائے جا رہا تھا۔ لواری ٹنل وہ جلتا ہوا مسئلہ ہے جس سے آپ چترال میں داخل

ہوتے ہی سامنا کرتے ہیں۔ آپکا ٹکراؤ کسی دوکاندار سے ہو۔ آپکی ملاقات کسی سرکاری ملازم سے

ہو۔ ہوٹل کے کسی بیرے سکول یا کالج کے کسی طالب علم کسی دینی مدرسے کا کوئی استاد کوئی باریش

بوڑھا بھینز بکریاں چرانے والا کوئی چرواہا کسی سے بھی انکے مسائل پر بات ہو۔ ہر تان لواری ٹنل پر

آ کر ٹوٹتی ہے۔

چترال سنٹرل ایشیا کا گیٹ وے دفاعی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کا اہم ضلع جس کی

سرحدیں افغانستان چین اور تاجکستان سے ملتی ہیں۔ چترالی محبت وطن مخلص اور قناعت پسند قوم

انکے لئے زندگی اور موت جیسے اہم مسئلے سے چشم پوشی کسی طور مستحسن نہیں۔

پنجاب کے مانچسٹر میں پڑھنے والی لڑکی اپنی تلخ نوائی کو شیرینی میں ملفوف کرتے

ہوئے کہہ رہی تھی ہم لوگ موٹروے کی تعمیر سے ناخوش نہیں خدا کرے ایسی بیسیوں موٹروے میرے

ملک کے طول و عرض میں بنیں۔ دکھ صرف اتنا ہے کہ حکمران ترجیحات کا تعین نہیں کرتے۔ موٹروے

وے کی کل اگت کا صرف نصف لواری ٹنل کے لئے درکار تھا۔ مگر بات صرف یہ ہے کہ اگر عوام

اور انکے گھمبیر مسائل اولیت پا جائیں تو خاص الخاص کیسے نوازے جائیں۔

اور پاکستان تو سچی بات ہے بنا ہی اشرافیہ کے لئے غریب تو جائیں جہنم میں۔

۱۹۷۳ء میں فرنیر ورکس آرگنائزیشن نے دس ہزار فٹ بلند اس درے سے سرنگ نکلنے کا تخمینہ اور تفصیلی رپورٹ بھنو حکومت کو دی۔ بلکہ کام کا آغاز بھی ہوا۔ پھر بند ہونے کی خبر تھی۔ دو تین باتیں گردش میں آئیں۔ سرنگ میں پانی نکل آیا۔ افادیت کے مقابلے میں اخراجات بہت زیادہ تھے۔ چند بیرونی مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ جب چترالی دانشوروں نے اُن فنی ماہرین سے جو مسٹکے کے تکنیکی پہلوؤں سے مکمل واقفیت رکھتے تھے بات کی تو انہوں نے کھر درے لہجے میں کہا۔ ”انسان اپنے عزم اور آہنی ارادوں سے کائنات کو تسخیر کر رہا ہے اور یہاں باتیں ہوتی ہیں پانی نکلنے کی وسائل کی کمی کی۔ دراصل ہم چترالی غیر اہم ہیں۔ آخر چھ روہ موڑوے جس کی اس مقروض ملک کو ابھی ضرورت نہیں تھی کے لئے وسائل فراہم ہو سکتے ہیں تو لواری ٹنل کے لئے کیوں نہیں جو ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہمارے مرد افغانستان کے غیر قانونی دشوار گزار اور کسی حد تک غیر محفوظ راستے پر خواتین کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔ افغان ہمارے بھائی ہیں۔ ہمیں اُن سے اور انہیں ہم سے محبت ہے مگر اپنی زمین اور اُسکے راستے اپنے ہوتے ہیں۔ دوسرا ملک اور اُسکا راستہ انکا ہوتا ہے۔ انسان اس پر اس اعتماد سے قدم نہیں دھرتا۔ ایک خوف اور دھڑکا پاؤں میں لرزش پیدا کرتا رہتا ہے۔“

ہماری تو اس تجویز پر بھی حکومتی اہلکاروں نے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ لواری ٹنل کے راستے پر چند پوسٹیں بنائی جائیں جن میں اُن جدید مشینوں کو رکھا جائے جو برف باری کی صورت میں فی الفور راستے کو صاف کر کے اُسے آمد و رفت کے قابل بنا دے اگر انڈیا مقبوضہ کشمیر میں لواری ٹنل سے کہیں زیادہ اونچی چوٹیوں پر ان مشینوں سے کام لے سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں لے سکتے مگر یہاں پھر وہی بات آتی ہے کہ ہم غیر اہم ہیں۔“

کاش کوئی طلسمی چراغ میرے پاس ہوتا۔ کوئی ایسا سامان جس سے میں انکی اشک شوئی کر سکتی انکے دل کا درد دور کر سکتی۔ انہیں بتا سکتی کہ وہ غیر اہم نہیں بہت اہم ہیں۔ پر مجھ ننگی پچھی کے پاس کیا تھا صرف لفظ۔

## دروش - لاوی

### اور غزالہ نگار اور ک زنی کا نہال

”دو دن سے فلائٹ نہیں آئی۔ آج بھی آنے کا چانس ۱۰ فیصد ہے۔ لوگوں کی تجل خواری دیکھی نہیں جاتی۔ آپ آج آئی ہیں اور ایڈ جسٹ ہونا چاہتی ہیں۔“ اس اتنے روکھے پھیکے اور قطعیت سے پُر جواب پر رد عمل کی صورت میں دو باتوں کا امکان تھا۔ غصے کا اظہار یا منت طرہ۔ صورت حال پہلی بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی تھی لہذا دوسری پر عمل کیا اور نتیجہ کچھ حوصلہ افزا ہی رہا۔

”کہاں جانا ہے؟“ جگہیں تو کئی باقی تھیں۔ ”بھر موغلشٹ، دروش، شندھو جھیل“ پر مجھے گھریا آنے لگا تھا بچے یاد آنے لگے تھے۔ لیکن اب جان گئی تھی کہ واپس جانے کا اختیار میرے پاس نہیں تھا تو پھر جلنے کڑھنے سے فائدہ۔ وقت کو گھوم پھر کر ہنسی خوشی سے کیوں نہ گزاروں۔

برآمدہ پار کیا۔ خوشبو سے بھری ہوئی ہو ایک تیز ہلار کی صورت میں میرے سینے سے یوں ٹکرائی جیسے کسی عاشق کا پھینکا ہوا گلاب اسکی معشوقہ کے سینے پر لگے۔ آسمان پر بادلوں کی بارات نے چترال کی اس صُبح کو دلکش اور رومان پرور بنایا ہوا تھا۔

پی آئی اے کی بلڈنگ سے باہر نکلی۔ سامنے پولو گراؤنڈ تھا۔ کچے اور گراسی گراؤنڈوں کو کچھ دیر دیکھتی رہی۔ چناروں کے درختوں تلے گھومی۔ A.K.R.S.P کا دفتر یہیں کہیں ہے وہاں سے نقشے اور تصویریں لینی ہیں۔ دفتر یہیں کہیں ہرگز نہ تھا۔ زرگراندہ روڈ تک چل چل کر

بھرتہ بننے والی بات ہو گئی تھی۔ ایریا منیجر سے ملاقات ہوئی۔ حسن و جوانی کا مرقع تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ شاہی فیملی سے ہے۔ تبھی انگ انگ پور پور نسلی تفاخر کا اعلان کرتی تھی۔ نقشے تو ملے پر خواتین سے متعلق تصویریں دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ چلو جو ملا اُسے بیگ میں ڈالا۔

اب سوچا کہ چھاؤنی کا پل ہی دیکھ لوں۔ جہاں سے چلی تھی اُن ہی سڑکوں کو پھر روندنے لگی۔ چترال سکاؤٹس کا دفتر چترال سکاؤٹس کا ہسپتال اور اسکے ساتھ ہی بڑا خوبصورت پل۔ پرانا پل بھی ذرا فاصلے پر تھا۔ چلو یا تھوڑی دیر کہیں بیٹھوں اور ذرا سستاؤں۔ میں نیچے اترنے لگی۔ بڑے سے ایک پتھر پر بیٹھ کر موسم کی شوخیوں اور حُسن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریائے چترال کی جولانیوں کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ چیانٹار گلیشر کے پانیوں نے کتنے پینڈھے مارے کتنے رنگ روپ بدلے۔ کہیں یہ یار خون کہلایا کہیں اسے مستوج کا نام دیا گیا۔ کتنا ظرف ہے اسکا۔ راہ میں تو رکھو ملا اسے گلے لگایا۔ ”لکھوہ“ نے شامل ہونا چاہا اسے بھی سینے میں جذب کیا۔ نہ حدوں سے خائف ہے نہ سرحدوں کا کوئی ڈر ہے۔ اسکی اپنی مرضی اپنا موڈ ہے۔ ارندو میں پاکستان کو خدا حافظ کہہ کر افغانستان میں داخل ہو جاتا ہے۔

پانی فطرت کا کتنا طاقتور عنصر ہے۔

وقت دیکھا ساڑھے نو۔ دفعتاً مجھے یاد آیا ارشاد کا گھر یہیں کہیں ہے۔ کیوں نہ اُس سے

ملا جائے۔ ارشاد سے میری ملاقات نشرف بی بی کے ہاں ہوئی تھی۔

محبت بھرا استقبال تھا۔ اسکی چھوٹی سی باغیچے سے گزر کر ہم بائی پنٹس (نشست گاہ)

میں بیٹھے۔ کمرہ جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ مٹی کے چولہے کو لپا پتا دیکھ کر

میری آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی کہ مجھے اپنی ماں یاد آئی تھی اُسکا ایسے ہی لپا پتا چولہا چونکا یاد آیا تھا۔

اچانک ارشاد نے کہا۔ ”کاش آپ تھوڑی دیر پہلے آ جاتیں۔“

”کوئی خاص بات“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”امی ابو اپنی گاڑی میں دروش گئے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار غزالہ نگار اور ک زئی ہماری

عزیز ہیں انکی نانی اماں سے ملنا تھا۔ چلو اسی بہانے آچکی بھی سیر ہو جاتی۔“

اب تاسف کا ایک سلسلہ تھا اور میں تھی۔ صبح کے کیے ہوئے سب کاموں پر ایک لعنت تھی اور میں تھی۔ گولی مارتی نکٹ کو۔ دفع کرتی نقشوں کو۔ جھاڑو پھیرتی دریا کے نظاروں پر۔  
جانے پھر اضطراری حالت میں یہ بات کیسے میری زبان سے نکل گئی۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم عام گاڑی سے دروش چلے چلیں۔“

ویسے مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ارشاد کہے گی ”آئی یہ کیسے ممکن ہے؟“

میری باچھیں کھلیں اور انہیں ضرور کھلنا چاہیے تھا کہ چترالی نوجوان غیر شادی شدہ لڑکی نے بڑی جی داری سے چادر ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا تھا۔ ”ضرور چلیں۔“  
اور ہم دروش کے لیے چلے۔

چترال کی مضافاتی وادیاں ”ژغور۔ بکر آباد۔ چورکن اور بروز“ پشاو روڈ پر دائیں بائیں واقع رنگ و رعنائی کی خوبصورت عکاس تھیں۔ بروز آیون کے بالمقابل خاصی بڑی وادی ہے۔ سڑک سے دریا کے پار اترائی میں آیون کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سید آباد کے بعد گہریت کا گاؤں تھا۔ اس وادی سے بھی بریر کو ایک راستہ جاتا ہے۔ گنگ اور کیسو کے بعد دروش آ گیا تھا۔  
دروش دروش کی گونج دار آواز نے جیسے میرے ذہن کی کھڑکی کو ایک جھٹکے سے کھول ڈالا۔ ”گوگول“ کے ناول ”TARAS BULBA“ کا وہ منظر میرے سامنے آیا جہاں یہودی یا نکل تاراس بلبہ کے سامنے اسکے بھائی دروش کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ ”میں نے دروش کی مدد کی تھی جب وہ قید میں تھا۔ مجھے دروش کے نام پر معافی دی جائے۔“

اس دروش کا نام کس پر ہے؟

دروش کیسی پر رونق وادی تھی۔ گہما گہمی اور ہنگاموں سے پُر روشن بازار۔ اشیائے ضروریات اور قعیش سے سجی دوکانیں جن میں بھاؤ تاؤ کرتے پر باش اور ماٹھے سبھی قسم کے لوگ۔ پجواروں کے ہارن آرنے چلنے کی آوازیں بھری پڑی آبادگلیاں۔ اللہ میرے کلیجے میں کیسی ٹھنڈک

اُتری ہے۔ پھلے پھو لے سدا یہ۔ سر سے پاؤں تک میں نہال ہوئی تھی۔  
 ارشاد بگنٹ بھاگے جاتی تھی اور میں منظروں سے آنکھیں لڑاتے ٹھوکریں کھاتے  
 اسکے پیچھے پیچھے تھی۔

بارے خدا کو دروش میں سابق چیئر مین یونین کونسل خورشید علی کے گھر داخلہ ہوا۔  
 اندر جانے سے قبل باغ کے رنگین پھولوں اور پھلوں کی ٹہنیوں کو ساون رُت کے خُسن میں جھوم جھوم  
 کر لہراتے دیکھا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ایل شکل کے کمروں والی عمارت کے سامنے وسیع و عریض  
 ان تھا جس میں کہنہ سالہ چوٹی تخت پوش بچھا تھا۔ غزالہ کی نہال کا گھر۔ کمرے میں بچھے قالین پر  
 ارشاد کی والدہ سے باتیں کرتے ایک معمر وجود نے گلے لگایا اور دروش آنے پر خوش آمدید کہا۔  
 میں نے ملحقہ واش روم میں جا کر ٹھنڈے ٹھار پانی کے چھینٹوں سے آنکھوں اور  
 چہرے کی دھلائی کی۔ وضو کیا۔ نماز کے لیے کھڑی ہوئی اور جب سلام پھیرا غزالہ کی نوجوان خالہ  
 ریحانہ شفقت اور ممانی کو چائے کے لوازمات کے ساتھ منتظر پایا۔

اور جب میں چائے پیتی تھی درمیانی قامت کا ایک ڈبلا پتلا لڑکا جس کا چہرہ موٹی موٹی  
 آنکھوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی سے سجا تھا کمرے میں آیا پاس بیٹھا اور بولا۔ ”نام میرا رضیت  
 باللہ ہے کہتے سب رضی ہیں۔ میں اس گھر کا ولی عہد ہوں۔ ہمارا گھر دروش میں ضرور ہے مگر یہ  
 پورا دروش نہیں۔ دو تین گھنٹے یہاں گزار کر آپ بھلا کیا لکھیں گی۔“

لڑکے کی ذہانت سے ہر بات مجھے اچھی لگی۔ میں مسکرائی اور بولی۔

”رضی میں بڑے منتخب گھر میں اُتری ہوں جو یقیناً دروش سے میرا تفصیلی تعارف  
 کروائیں گے۔ اور یہ واضح ہو کہ میں ”تیسرے دن کا مہمان زحمت نہیں“ بنوں گی البتہ رحمت  
 کے دو دن ضرور کاٹوں گی۔“

”تو پھر ایک گھنٹہ بعد میں حاضر ہوں گا۔“

میں ریحانہ شفقت کے ساتھ باہر آ گئی۔ چوٹی تخت پر بیٹھ کر انہوں نے دروش کی تعلیمی

حالت پر بات چیت کی۔

وادى کے چہرے مہرے پر اسکے بھرے پُرے ہونے کا جو احساس آغاز میں ملا تھا تعلیمی اور طبی میدانوں میں اسکی ترقی نے اسکے سچ کو ثابت کیا تھا۔ تقریباً ۲۷ پر انٹری سکول ہر سکول میں زیر تعلیم ۴۰۰ بچے۔ ہائر سیکنڈری دستکاری سینٹرز اور ٹیکنیکل سکول ہیں۔ وادی کی لڑکیاں ضلع دیر تک سیکنڈری سکولوں میں پڑھانے جاتی ہیں۔ خود ریحانہ کئی سال لاوی دروش میں پڑھاتی رہیں۔ آجکل وہ L.O.C ہیں۔

لاوی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ریحانہ سرور آواز میں بولیں۔

”لاوی کا گاؤں اونچے پہاڑوں کے سروں پر واقع کھلے میدانوں میں ہے۔ وہاں کے لوگوں اور طلبہ و طالبات کا تعلیمی رجحان دلچسپی اور ہمارے لیے انکا دیدہ و دل فراش کرنا ایسے خوش آئند امور تھے کہ پہاڑوں کی چڑھائی اُترائی کی اذیت کے باوجود ہم نے ہمیشہ وہاں جانے اور انہیں پڑھانے میں سرشاری محسوس کی۔“

”ریحانہ کیا لاوی کی سیر ہو سکتی ہے؟“ میں تجسس اور شوق کے ہاتھوں بول پڑی تھی۔  
”ارے ضرور کل ہی چلیں گے۔ میرے لیے تو یہ عمر رفتہ کو آواز دینا والی بات ہوگی۔ انجوائے کروں گی۔“

اور جب غزالہ نگار اور کزئی اور اسکے بہن بھائیوں کا بچپن زیر گفتگو آیا۔ ”اسی چوہی تخت پر ایسی ہی ساون رتوں میں وہ میرے پیارے دلارے ساون گیتوں اور کہانیوں کی فرمائش کرتے۔“ ریحانہ کا لہجہ کیسا گلوگیر سا تھا۔

پھر وہ لڑکا آیا جو میرے بیٹے کی عمر کا تھا اور میں اسکے ساتھ چلی۔

پتہ نہیں میرے اس جذبے میں کوئی مقناطیسیت تھی جو میرے اندر سے اُڑ کر اس لڑکے کے دل سے جانکرائی تھی۔ کیونکہ وہ مجھے سب سے پہلے اس سرزمین کی خوبصورت ترین جگہ پر لے گیا جس کی مجھے خواہش اور تمنا تھی۔

مسجد کیا تھی رنگوں کی پھوار میں بھیگی ہوئی جسے دیکھتے ہی دل میں جذب و شوق کی دنیا اُٹھ آئے۔ فوارے کے چھینٹے اڑاتے پانی سے وضو اور کپڑوں میں مسکراتے رنگارنگ پھولوں سے آنکھوں کو روشن کیا۔ اور پھر پورے وجود کو مجسم عجز کرتے ہوئے زمینوں اور آسمانوں پر پچھی اُسکی کرسی کے قدموں میں پیشانی جھکائی۔ دعا کے لیے پھیلی ہتھیلی پر خواہشوں کے انبار تھے جنہیں ایک کے بعد ایک اسکے حضور پیش کرتی گئی۔

”آپ چترال سکاؤٹس کے کرنل مراد خان کے لیے دعائے خیر کر دیں کہ جنہوں نے وادی کو یہ خوبصورت تحفہ دیا۔“ رضی کے لہجے میں نمی سی گھلی تھی وہ خود بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔

رضی سیاستدان گھرانے کا لڑکا تھا۔ سیاست پر باتیں کرتے ہوئے بہت پُر جوش تھا۔ گاڑی کا ایکسیلیٹر لہجے کے چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ دبا جا رہا تھا۔ اور میرا دم نکلا جاتا تھا۔

”یہاں تین سیاسی پارٹیاں ہیں۔ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی۔ بھٹو کا بہت مداح تھا۔ بھٹو نے عام آدمی کو زبان دی اُس نے انہیں اپنے حقوق کا احساس دلایا۔ غضب شدہ زمینیں واپس اُن غریب ہاریوں کو دلائیں جنکے وہ اصل مالک تھے۔“

درویش کی کشادہ گلیوں اور محلوں میں اُسکی گاڑی بھاگی پھرتی تھی۔ لنگا۔ پونڈیاں دہ۔ بتانے اور چلنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ریٹ ہاؤس سے گاڑی نے چڑھائی چڑھی ”یہ ڈاپ نغور ہے۔ درویش کی مرکزی جگہ۔ سابق گورنر درویش کے بیٹے مصمام الملک کا گھر یہیں ہے۔ میں گاڑی یہاں روکتا ہوں آپ چاہیں تو اُن سے مل آئیں۔“

میں ایک بڑے گھر میں داخل ہوئی۔ مسز ضیاء سے ملاقات ہوئی۔ پرنس محی الدین کی صاحبزادی اور مصمام الملک کی بہو۔ باریش مصمام الملک۔ محبت اور پیار بھرے لہجے میں باتیں کرتی ان کی بیگم۔ چائے پینے اور ٹھہرنے پر اصرار۔ ”بس آپ سے ملنا تھا مل لیا۔“ کہتے ہوئے میں باہر آ گئی۔

چترال سکاؤٹس کا سابقہ ہیڈ کوارٹر بہت سی باتوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کے سینے پر بل کھاتی سڑکیں اُن شاندار کمروں کے دروازوں تک جاتی تھیں جن میں چترالی تہذیب اور ثقافت زندہ تھی۔ دیواریں اگر مارخور آئیگیس اور اوڈیال کے سینگوں سے بچی تھیں تو میڈلز چترالیوں کی شجاعت و دلیری کے داستان گو تھے۔

سرنی دف چترالی ستار جیسے آلات موسیقی اگر انکی فنون لطیفہ سے محبت کے اظہار کے نمائندہ تھے تو پرانے زمانوں کے آلات حرب اور گھریلو استعمال کی اشیاء کھون (جوتے) پیالے کپڑے انکی اپنے ماضی سے تعلق اور دلچسپی ظاہر کرتی تھیں۔

لابریری ہر موضوع پر کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ بلیئر ڈروم وی وی آئی روم سب شاندار تھے سڑک سے نیچے کا نظارہ دل فریب تھا۔ کرنل مراد کی مسجد کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلنے لڑکے گہمیں اور رنگینیوں والا بازار پھر گاڑی چلی۔ پرانا بازار اس سے آگے سول اسپتال۔ دستکاری سینٹر۔ تھانہ۔ قرب و جوار کے علاقے پرنس محی الدین کا ذاتی حلقہ کا کٹک۔ دروش زندگی اور اناج سے بھری پری دو فصلی وادی۔

جب واپسی ہوئی ارشاد اور اسکے امی ابو جانے کے لیے تیار تھے۔ افراد خانہ کی طرح میں بھی انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑی تھی۔ اگر کہیں جنت مکانی اماں ہوتیں تو ضرور کہتیں۔  
دھیئے تیریاں سایاں کتھے ودا یاں کتھے۔

رات کو رضی کی درد بھری داستان محبت سُنی۔ بے چارہ لڑکا ایک طرفہ محبت کے روگ میں مبتلا تھا۔ What a nonsense میں نے اُسے پیار بھری ڈانٹ دی۔ ”اُسے بتاؤ۔ کم از کم اپنے جذبات کا اظہار تو کرو۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو۔“

”حوصلہ نہیں پڑتا انٹی۔ رضی بے بسی سے بولا۔ میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہے وہ اور میں محض ایک گریجویٹ۔“

”پہلے اپنے جذبات کو زبان تو دو۔ کھل کر اظہار کرو۔ محبت میں سب چلتا ہے۔“

لاوی کا تجربہ بہت دلچسپ تھا۔ ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی جب گاڑی کے ہارن پینچنا شروع ہو گئے۔ ریحانہ اور میں باہر بھاگے۔ ریحانہ کی دوست الوینہ تاج جو وہاں ٹیچر تھی اُسے لیا۔ گول کی گزرگاہ پر جیپ نے اتار دیا اب پہاڑ پر چڑھائی تھی۔ یہ تجربہ میرے لیے نیا تو نہ تھا میں سکر دو میں برنس اور گلگت نگر میں ایسی چڑھائیوں سے آشنا تھی۔ مگر جب کچھ وقت گزر جائے تو ہر بات نئی لگتی ہے۔ ٹیڑھا میڑھا راستہ سانس پھول پھول پڑتا تھا۔ کوئی جوانی تو تھی نہیں کہ مشقتوں کے بار تلے رگید نے کے باوجود تازہ دم رہتی۔

سجان اللہ اوپر تو جیسے باغ بہشت کا نظارہ تھا۔ گل و گلزار کھلا پڑا تھا تا حد نظر پھیلی ہوئی ایک اور حسین وادی جہاں گھر کھیت کھلیان پہاڑ درخت چشمے پانی کے بہتے کھال کس نعمت کی کمی تھی یہاں۔ مولا تیرے کیسے کیسے رنگ اور ڈھنگ ہیں۔ واقعی بندہ خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے۔ چھوٹا سا اسکول جہاں بچیاں گھومتی پھرتی تھیں۔ کمرے میں ناشتہ رکھا تھا۔ چترالی پرائیڈا انڈہ اور چائے۔ لڑکیوں کے چہرے ریحانہ کو دیکھتے ہوئے گلنار سے تھے۔ میری پنڈلیوں میں اینٹھن تھی۔ ابھی اترائی بھی سر پر سوار تھی۔ اسکے باوجود میں نے وادی کے نظارے لوئے۔ خوبانیاں کھائیں تو ت کھائے جگہ جگہ چشموں کا پانی پیا۔ اور وقت کے ایک ایک لمحے سے لطف اٹھایا۔

## ریمبور۔ موت کا کھیل

### افلاس اور جاپانی ایکو

اُس چھوٹے سے لان میں چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے بیٹھے صدیوں پرانے چنار کے درخت کی شاخوں اور پتوں کو تیز ہواؤں میں جھولتے جھومتے اٹھکھیلیاں کرتے ادائیں دکھاتے اور بوس و کنار سے لطف اندوز ہوتے دیکھتے دیکھتے عمارت کے آنگن میں بوڑھے اور جوانوں کے ایک بلاک سے دوسرے میں جانے والے قدموں کو گنتے گنتے اور پھر اُس چھوٹے سے سایہ فگن آسمان پر نظریں جمائے اپنے دل کی دھڑکنوں کو لا الہ اللہ کے ورد سے ہم آہنگ کرتے کرتے جب میں ادب سی گئی تو سوچا ”آخر میں ہمیشہ غلطیاں کیوں کرتی ہوں“ تبھی اے کے آرایس پی کی بلڈنگ کے صحن میں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک کے ڈرائیور نے مجھے آواز دی۔ ”آئیے چلیے۔“

پشاور روڈ سے آیون کسی ایسی دلہن کی طرح نظر آتا ہے جس کا ایک ایک انگ حسنِ دلربائی کی تصویر ہو۔ پر جو نبی نیچے اتر کر نقاب کشائی ہوتی ہے تو ایک بھدا بے رونق اجڑا ہوا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے یوٹرنز کی خطرناک چڑھائیوں اترائیوں کے بعد بلندی پر گاڑی کے سیدھا ہونے پر وہی دلربائی دامنِ دل کو پھر کھینچتی ہے۔

ژوبار چیک پوسٹ سے ریمبور جانے کے لیے ڈرائیور نے گاڑی دائیں ہاتھ موڑ لی۔ راستہ بہت تنگ اور دشوار گزار تھا۔ سیاہ اور براؤن چٹانیں خوفناک تھیں۔ بہت نیچے نالہ ریمبور بہتا

تھا۔ چوبلی پل پر کراسنگ کے بعد گاڑی کے سامنے عمودی چڑھائی تھی۔ یہ چڑھائی دبلانے والی تھی یوں کہ دو قدم آگے بڑھتے تو چار قدم پیچھے لڑھکتے۔ چند بار کے اس عمل سے مجھے یوں لگا جیسے تڑپتی اور ہونکتی گاڑی اب نالے میں لڑ کر ہی دم لے گی۔

میرا اضطراب اور بے چینی ڈرائیور سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی شاید اسی لیے اسکی آواز میں اطمینان تھا اور لہجے میں داسا۔

”پریشانی والی بات نہیں یہاں گاڑی کور یورس کیے بغیر آگے نہیں جایا جاسکتا۔“

درے نما راستے کے بعد آسمان کی کشادگی اور درختوں فصلوں کی ہریالی خوف و دہشت کی لڑاب میں ڈولتے ڈوبتے دل کو زندگی کے حسن اور رعنائی کے توانا احساس سے قوت دیتیں۔

”گمبائیک پل۔ ڈرائیور نے بتایا۔ نالے کے ساتھ راستہ دیکھیے۔“

میں نے آنکھوں کو ممکنہ حد تک پھاڑتے ہوئے اشارہ کردہ سمت کی طرف دیکھنا شروع کیا یہ راستہ اُس جنگل کو جاتا ہے جہاں بہت بڑی چراگاہ اور کھیت کھلیاں ہیں۔ موسم گرما میں کاشتکاری ہوتی ہے۔ یہاں سُرخ رنگ کے پانی کا ایک چشمہ ہے جو پیٹ کی بیماریوں کے لیے اکیسر سمجھا جاتا ہے۔

پراکالک۔ کوٹ دلش۔ بالادیش۔ اوچھوک گول کے گاؤں گزرتے گئے۔ اور ایک عجیب سا منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا گیا۔ کالا ش مردوزن پیر و جواں بچے بالے راستے پر کہیں جتھوں میں کہیں اکا دکا نشیب میں بہتے نالے کی طرح ہوائی فائرنگ کی گھن گرج کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

”مرکز میں کوئی مر گیا ہے۔ موت بھی کسی امیر آدمی کی ہے۔“ ڈرائیور نے مجھے مطلع کیا۔ موت کیسا خوفناک دہشت بھرا اور وجود کی رگ رگ میں کپکپی دوڑانے والا لفظ ہے۔ پر یہاں گاڑی میں اسے سن کر میرے اندر جیسے مہتابیاں سی چھننے لگی تھیں اس لیے کہ نسلی تخلیق کے لیے ملاپ کے بندھن موت خوشی و غمی جیسے فطری عناصر کسی بھی قوم قبیلے کے وضع کردہ رسم و رواج اور طور

طریقے اسکے مزاج اور خصوصیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

”چلو اب یہ تو دیکھوں گی بی۔“

مرکزی وادی گروم میں جب داخلہ ہوا تو سچی بات ہے یوں محسوس ہوا تھا جیسے طبل جنگ بجا ہو۔ ہوائی فائرنگ اور لوگوں کا جم غفیر اوپر پہاڑوں کی طرف رواں دواں تھا۔ کالا ش ہوٹل کے سامنے ڈرائیور نے مجھے اتار دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ”موت کا یہ کھیل اب دو تین دن چلے گا۔ اطمینان سے رہیے اور دیکھیے۔“

موت کے اس ہنگامے کو دیکھنے اور اسکے بارے میں جاننے کی شتابی کے ساتھ ساتھ میرے لیے مصر کی نماز کے لیے کسی مسجد کے فرش پر سجدہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ہوٹل کے عقبی لان سے ماحول کی دلکشی سے لطف اندوزی کو میں نے کسی دوسرے وقت پر اٹھا دیا اور باہر نکل آئی۔ دریا کے کنارے ایک گاڑھ مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں نے اس نئی زمین پر عاجزانہ عبودیت کے اتھاہ جذبے کے زیر اثر سر جھکا دیا تھا۔

دریا پر بنے چوٹی پل پر پار سے آتے ایک نوجوان لڑکے کو میں نے روک لیا۔ وادی کی اس ہنگامی حالت پر بات چیت سے معلوم ہوا کہ کالا ش قبیلہ مردے کو اس کی موت کے فوراً بعد چار پائی پر ڈال کر ڈانس ہال لے جاتا ہے۔ گروم گاؤں کے ایک معزز آدمی کا آج گیارہ بجے انتقال ہو گیا ہے۔

میری اوپر جانے کی خواہش پر اس نے فی الفور چلیے کہہ کر ہاتھ بڑھا دیا۔ شوق کے ہاتھوں پیٹ کا مسئلہ پس پشت چلا گیا۔ حالانکہ اس وقت بھوک کی شدت سے میری کنپٹیوں میں ٹیسس سی اٹھ رہی تھیں۔ بیگ سے بسکٹوں کا پیکٹ نکال کر میں نے بسکٹ کھاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

کیا عجیب منظر تھا دائیں بائیں آگے پیچھے ڈھول بجاتے ڈانس کرتے ہا ہو کی آوازیں نکالتے زینہ درزینہ چڑھائیوں پر سیاہی سے اٹے پڑے دو منزلہ سے منزلہ گھروں کے ساتھ ساتھ

تنگ راہوں پر چلتے لوگوں کا ایک ہجوم ندی کے سبک خرام پانیوں کی طرح بہتا چلا جاتا تھا۔  
 یقیناً یہ دو سو فٹ کی بلندی تھی۔ فطرت کی گود میں رنگوں کی روشنی میں ہنستا مسکراتا  
 اٹھکھیلیاں کرتا یہ ایک بھر یا میلہ تھا۔ پر ذرا آگے ایک حیرت انگیز منظر بھی تھا۔ چار پائی پر ایک میت  
 ستونوں پر مشتمل بے درود یوار چھت والی ایک کشادہ اور ہموار جگہ کے پتھوں بیچ پڑی تھی جسے دیکھنے  
 میں یہاں آئی تھی۔ تین چار عورتیں سر ہانے بیٹھیں سر کے کھلے بالوں سے چہرہ ڈھانپنے اپنی زبان  
 میں اونچے اونچے کچھ گارہی تھیں۔ مرنے والے کی بیوی بہنیں اسکی قصیدہ خوانی میں مصروف  
 ہیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا۔

اب سورج کی تاریکی کرنوں نے ایک اور منظر کا راستہ کھولا۔ دو کالاشی بزرگ ہاتھوں  
 میں چھوٹی چھوٹی کلبازیوں کے ساتھ مجمع میں سے نکلے آگے بڑھے میت کے قریب آئے اور بلند  
 آواز میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ہزاروں کا ہجوم دم سادھے کھڑا تھا۔ اُس سے مجھے اپنا آپ ماضی  
 کی کسی ایسی نسل میں محسوس ہوا تھا جہاں وہ رزمیہ شاعری کرنے والا ہومر ایسے ہی ماحول میں کھڑا  
 ٹروجن وار کے بعد پولیسس کے کارناموں اور اسکی دس سالہ طویل مسافتوں کی داستان گارہا ہو۔

اس سین کا کلائمکس اسوقت ہوا جب انہوں نے اپنی کلبازیاں میت کے وسط میں لا کر  
 نکرائیں۔ اس زوردار نکراؤ کی ٹنگ گویا وہ صور اسرافیل تھی کہ جس نے فطرت کے نظاروں میں  
 گھرے اس کشادہ قطعہ پر کھڑے لوگوں کو یوں مہمیز کیا کہ ان کی خاموش زبانیں اور اجسام اس طرح  
 متحرک ہوئے کہ سیٹوں کے ساتھ ایک ایسا زوردار ڈانس شروع ہوا کہ لگا جیسے کائنات اب کسی  
 تند و تیز بگولے میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیتی پھیتی ہو کر بکھر جائے گی۔ اس جگہ کے ساتھ ایک خستہ  
 حال عمارت تھی۔ سردیوں کا ڈانسنگ ہال جس کے ستونوں پر بکرے کے نقش و نگار تھے۔

جب ڈھول کی ڈھم ڈھم کانوں کے پردے پھاڑتی تھی۔ جب گولیوں کی تڑتڑاہٹ  
 اور سنناہٹ رگوں میں خون کو منجمد کرتی تھی اور جب حسیناؤں کے پُرے رقص بسل میں مگن تھے  
 میرا گائیڈ مجھے مہاندیو کی زیارت کی دعوت دیتا تھا۔ سامنے والی پہاڑی پر بڑے سے پتھر کے

سائے تلے چار دیواری میں مہاندیور ہتا ہے۔ میں نے دیکھا راستہ تنگ بھی تھا اور دشوار گزار بھی وقت کی کمی بھی پیش نظر تھی۔ یہاں گھوڑوں کے چوہی سروں والے مجھے ہوں گے جا بجا دیواری کی ٹہنیاں خون کے چھینٹے جلتی آگ یا شاید راکھ ہو۔ قربان گاہ میں یہی سب کچھ ہوتا ہے نا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اُسے دیکھا تھا۔

میری انتزیاں اُس وقت بھوک کی شدت سے بلبلا رہی تھیں۔ اُترائی کی دشواری بھی سامنے تھی۔

اُترتے سے میری حالت اُس دلہن جیسی تھی جس نے بالشت بھرا اونچی ایزی کا جوتا اور زمین پر لٹنیاں لیتا شرارہ پہنا ہو اور جو پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی ہو اس ڈر سے کہ کہیں لڑھک لڑھکا کر تمسخر کا باعث نہ بن جائے مجھے تمسخر کا نہیں ہڈی جوڑ کے اناڑیوں کے پاس پہنچنے کا ڈر تھا۔ گورڈن کانج راو پلندی کے چند طلبہ کی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرنے کی ادائیں دیکھ کر ذرا عمر رفت کو آواز دینا یاد آیا تھا۔

ہوٹل میں لوبیا کا بد مزہ سا سالن تھا۔ اکڑی ہوئی روٹی تھی۔ شکوہ کرنے پر سُننے کو ملا تھا۔ آرڈر دے کر جانا تھا۔ اور اگر مُفتے کی مقامی ذائقہ دار چیزیں کھانی تھیں تو اوپر ٹھہرنا تھا۔ جس (چربی میں بنایا ہوا نمکین حلوہ) اور اُبلا ہوا گوشت ملتا۔ جس نیچے کے حلووں ولووں اور اُبلا گوشت روست کے سوا کو بھلا دیتا۔

پیاز اور ٹماٹر کے سلاد کے ساتھ جو ملا اُسے غنیمت جان کر آہستہ آہستہ چبا کر حلق سے اتارتے ہوئے میں نے لڑکے کو سنا۔ تین دن یہ میلہ چلے گا۔ پنیر گوشت چاول منوں کے حساب سے اڑے گا۔ کالاش موج میلے والا مذہب ہے۔ کھاؤ پیو موج اڑاؤ اس کا سلوگن ہے۔ لڑکا بنتا تھا۔ اور میری معلومات میں اضافہ بھی کرتا جاتا تھا۔

”یہ امیر آدمی ہے اب اسکی اولاد اسکا چوہی مجسمہ بنا کر کسی جگہ گاڑ دے گی۔“

متاثرین میں بیوہ کی نسبت بیچارے رنڈوے کی حالت زار زیادہ قابل رحم جاننے کو

ملی۔ چلو بیوہ پانچ ماہ تک اپنے برتن بھانڈے ہی الگ کرتی ہے پر مرد کو تو شوم (لکڑیاں رکھنے کی جگہ) میں رہنا پڑتا ہے۔ روٹیاں کچھ کروانے کے انداز میں پھینکی جاتی ہیں۔ غریب پانچ ماہ تک چھوٹوں جیسی زندگی گزارتا ہے۔ یہ انداز سوگوار خاندان سے محبت کا اظہار ہے۔

اوپر ڈھول بجاتا تھا۔ لالٹینیں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی تھیں۔ اور رقص جاری تھا۔ میں نے نیند کی چادر اوڑھی اور پسر بتوں کی ان رنگ رنگیلی شہزادیوں کے ساتھ انجانے دیسوں کی طرف روانہ ہو گئی۔

صبح کی آنکھ میں بالکپن تھا۔ ایک جادوئی کیفیت تھی جو کشاں کشاں کھینچ کر مجھے سحر زدہ انسان کی طرح دریائے ریمبور کے پار لے گئی جہاں درختوں کے جھنڈوں میں دو منزلہ سے منزلہ چوٹی گھرتے۔ بوڑھی عورتیں بچے کھیت کھلیان اور وادی کا اکلوتا بجلی گھر تھا۔ سورج کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ میری چلنے کی رفتار بھی جاری تھی۔ تھوڑا سا آگے بڑھتی تو خود کو ایک نئے منظر کے حسین دھار میں پاتی۔ ایسے میں مجھے وہ لازوال شاعر یاد آیا تھا۔ ”ورڈز ورتھ“ جسکی حسن فطرت پر بے مثال نظمیوں اسکی میلوں لمبی پیدل سیروں کے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ تھیں۔ دریائے ریمبور کی روانیاں شاید Derwent کی روانیوں سے لگانہ کھاتی ہوں اور Grasmere کے پہاڑوں کی شان بان ریمبور کے پہاڑوں جیسی نہ ہو۔ پر یہ سرسبز چراگاہیں یہ پھیلے جنگل بھیڑ بکریاں چراتے چرواہے۔ آسمان کی وسعتوں میں مقید یہ دلر با منظر کاش میں شاعر ہوتی۔

اور جب میں واپس آ رہی تھی میں نے اُسے دیکھا تھا اور دیکھ کر ٹھٹھکی تھی۔ ورڈز ورتھ

نے یہ شعر ایسی ہی کسی نازنین کے لیے کہا ہوگا۔

She was a phantom of delight

When she gleamed upon my sight

مقامی تھی پر سرتا پامفرد۔ اسکے انداز دید میں خود نمائی اور اپنے ہونے کا بھرپور اظہار

یہ اقلاس تھی۔ کافرستان کی پہلی میٹرک پاس لڑکی جو بعد میں پائلٹ کے طور پر بھی مشہور ہوئی۔ اسکے لباس پر نہ بوسیدگی تھی اور نہ پرانا پن۔ سر کے بالوں کی مینڈھیاں خوبصورت اور تازہ گندھی ہوئی تھیں۔ ٹوپی میں مرغ زریں کے نئے نکور پر چمکتے تھے۔

پھر اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور اپنے گھر لے گئی۔ اُس کا دو منزلہ گھر بولتا تھا کہ اس کا سربراہ بالائی چراگا ہوں کی زمینوں جنگلوں کے قیمتی درختوں اور بے شمار بھیڑ بکریوں کا مالک ہے پر بشمارہ خان یہ سب نہیں بولتا تھا۔ یوں ڈھائی پسی کے بشمارہ خان کو جسکی اندر کو دھنسی آنکھیں گال اور سانولی رنگت دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ مہکتے تروتازہ گلاب جیسے چہرے والی طرح دار لڑکی ایسے بے سرے آدمی کی بیٹی ہے۔ وہ اوپر سے تھوڑی دیر قبل آیا تھا۔ شہری ناشتہ بسکٹ اور چائے پیش ہوئی پھر وہ مجھے ایکو سے ملانے لے گئی۔

ایکو جلانے کے لیے لکڑیاں جنگل سے کاٹ کر لاتی ہے۔ فصلوں کی بوائی اور کٹائی میں حصہ لیتی ہے۔ بھیڑ بکریاں چراتی اور کھانا پکاتی ہے۔ ایکو کو ہمارے رسم و رواج اور کلچر سے عشق ہے۔ اور وہ انکی ادائیگی جذب سے کرتی ہے۔ وادی گروم کی سڑک پر چلتے اور اس مہ لقا کی باتیں سنتے ہوئے مجھے موپساں کی کہانیاں یاد آئی تھیں جنکے کردار متنوع بڑے منفرد اور انسانی نفسیات کے گنجشک رویوں کے بہترین عکاس ہوتے ہیں۔

کیا ایکو بھی ایک ایسا ہی کردار ہے؟ میرا اپنے آپ سے استفسار تھا۔

نچلی منزل کے مویشی خانے اور گودام سے گزر کر دوسری منزل کی چند چوبی سیڑھیاں چڑھ کر میں صحن میں آکھڑی ہوئی۔ کھلی انگنائی سے بڑے کمرے میں داخلہ ہوا۔ وہی مانوس سے منظر دھوئیں سے سیاہ دیواریں اور چھت چار پائیوں پر بکھرے جلیھے گھودیلے۔ گندے مندے برتن بھانڈے جلتی آگ اور راکھ کا ڈھیر۔ دُنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملک جاپان کی ایکو کالاشی لباس کے سب لوازمات سے بچی سنوری کہیں نقطہ آغاز کی پراسرار غاروں والے زمانے کے دہانے پر کھڑی اپنے طباق سے چہرے پر بکھری مسکراہٹ لیے بندے کو سوچوں اور حیرتوں کی گھمن گھیر یوں میں

ڈالتی تھی۔ دو دنیاؤں کا تضاد ذہن پر ضربیں لگاتا تھا۔ اسکا شوہر عام سا کالا لاشی جوان اور عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔

ایکو میری ذہنی دیواروں پر چمٹ گئی تھی۔ ”پکھ نہ دیکھے سالناتے عشق نہ کچھے ذات تے نیند نے ستر ملیا جتھے پہ گئی رات“ والی مثالیں سب ٹھیک۔ پر بھوک نیند اور عشق لوازمات کے بغیر کتنے دن چلتی ہے؟

## شندھور۔ پولومیلہ

### اور شوکن میلے دی

سچ تو یہ تھا کہ میرے شب و روز ان میں رواں دواں لمحے ان لمحوں میں متحرک سماعتیں اس لوک گیت کی عملی تفسیر بن کر میرے گرد و پیش ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی صورت سینہ تان کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں کہ شوکن میلے دی کو یہ سمجھنے میں مشکل کا سامنا تھا کہ وہ گواچی گاں کی طرح منہ اٹھا کر چترال کیوں چل پڑی تھی اسے اہم فیسنولز پر ہوم ورک کیوں نہ کیا تھا۔

اب 12500 فٹ کی اونچائی پر بلند پہاڑوں سے گھری شندھور جھیل اس کی خوبصورتی و رعنائی اور اس پر ہونے والے پولومیلے کا دھوم دھڑکا، حقیقتاً میں تو کورے کاغذ کی طرح بلیٹنگ تھی۔ جب وادی شغور کے راجہ جناب کرنل متاع الملک کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نے دریائے گرم چشمہ کے کنارے پڑے پڑے سے پتھر پر بیٹھ کر بتایا کہ یوں تو پورا چترال حسن و جمال میں یکتا ہے پر شندھور جھیل کا ٹونا تو یوں لگتا ہے جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا اپنے مرکز سے پھٹ کر بھولے سے راہ بھٹک کر یہاں گر پڑا ہو۔ غروب آفتاب کا نظارہ آپ چاہیں گی کہ کاش کوئی وقت کے تیز رفتار پاؤں میں پہنچیاں پہنا کر انہیں اپنے کلاوے میں جکڑ کر ساکت کر دے کہ سورج کی آخری بسنتی کرنیں عمودی ہو کر جھیل کے بتے پانیوں پر ایسا خوبصورت راستہ بناتی ہیں کہ جس پر آنکھیں بند کر کے چلنے کو جی چاہے بلا سے بندہ گہرائیوں میں غرقاب ہی ہو جائے اور طلوع آفتاب جیسے تبسم میں نہایا پیلا گلاب دھیرے دھیرے اپنا منہ کھولے اور جب میلہ لگتا ہے تو بس یوں لگتا ہے جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کا بند منہ کھل گیا ہے اور اس میں سے رنگین لاوے کی بجائے

خوش رنگ تتلیاں نکل کر سارے میں پھیل کر اڑتی پھریں۔ میں نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ مجھے اپنے سینے میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے تھے۔ اتنا پینڈا مارا چترال پہنچی اور اصل چیز پھر بھی نہ دیکھ پائی۔

”اگلے سال“ میرے اندر نے کہا

پر کہیں دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ کون جانے پل کا بھروسہ نہیں اور میں بڑے بوجھل دل کے ساتھ نیچے اتر آئی تھی۔

کبھی کبھی جب میں مغرب کی نماز کھلے آسمان تلے پڑھتی تو جیسے پیشانی کہیں جھیل کے سبزہ زاروں پر سجدہ ریز ہو جاتی۔

اور اگلے سال 1997 میں جب جانے کے دن آئے میری خلیری، ممیری اور چچیری بہنیں کہ سب استاد تھیں گرمائی تعطیلات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ کے گھر جانے کا پروگرام بنا بیٹھیں۔

اللہ اور اس کے پیارے کے گھر جانے کو یقیناً دل چاہ رہا تھا پر سال بھر سے جس خواب کی فینٹسی نے آنکھوں میں ان دیکھے مناظر منجمد کر رکھے تھے وہ تعبیر پانے کے لیے مضطرب تھے۔ میں نے بڑی مسکینی سے اپنی ممیری بہن سے کہا..... ”ابھی تو وقت ہے میں ایک چکر نہ لگا آؤں۔“ پر اللہ کی محبت میں لتھڑی ہوئی میری اس بہن نے میرے لئے لیے۔

”چپکی بیٹھو۔ کبخت جو وہاں چوٹیوں سے لڑھک وڑھک گئیں کوئی انیس اکیس ہو گئی تو سیا پاپڑ جائے گا۔ ہم جو ہزاروں منتوں مرادوں سے وہاں جانے لگے ہیں وہ تو کھٹائی میں پڑ جائے گا۔“

یوں میں اللہ کا چمکتا دمکتا رنگ رنگیلا آنکھوں کو خیرہ کرتا حسن اور شان دیکھنے کی بجائے اس کے جاہ و جلال اور اس کے محبوب کے الوہی سکون ٹپکاتے جمال سے دل کو ٹھنڈک پہنچاتے گھروں کو دیکھ آئی۔

پر بڑی چندال تھی میں بھی اس کے گھر میں بیٹھ کر بھی دھیان کبھی کبھی اس کی شان دیکھنے کی خواہش میں ہچکولے کھانے لگتا۔

اب تیسرا سال آن لگا تھا۔ جیسے کوئی کنواری دوشیزہ اپنے بیاہ کی نامزد تاریخ کا انتظار نہایت بے چینی ذوق و شوق اور لگن سے کرتی ہے۔ بعینہ شوکن میلے دی کو بھی جولائی کا انتظار تھا۔ ڈاکٹر بھانجی نے سنا تو کہنا ضروری سمجھا۔

”آئی آپ بلڈ پریشر کی مریض ہیں اتنی بلندی پر آکسیجن کی کمی کا مسئلہ ہو سکتا ہے سوچ سمجھ کر جائیے گا“..... پر میرا جنون کسی بندش تلے نہیں آ رہا تھا چھوڑ دو دیکھا جائے گا۔

مہر النساء سیر و سیاحت کی دلدادہ خاتون ڈاکٹر آغا سہیل کی فیملی فرینڈ میرے ساتھ اس وقت شامل ہوئی جب میں ٹکٹ کے لئے پشاور فون کرنے ہی والی تھی۔

چلو یہ اچھا ہوا۔

میں تنہا سفروں کی عادی ہو گئی ہوں۔ پر کوئی ساتھی مل جائے تو کیا بات۔ میاں کی تو تسلی ہو جاتی ہے۔

یہ شام تھی صبح لاہور کی پشاور کے لئے فلائیٹ بک تھی۔ جب اچانک میز پر پڑے باسی اخبار کے شوبز والے صفحے پر داہنے کونے میں سارے پروگرام پر بجلی گرانے والی تین لائنوں کی خبر تھی۔ سرحدی جھڑپوں کی وجہ سے شندھور میلہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے افسردگی سے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا یہ تو ”ناتی توتی رہ گئی تے اُتے مکھی بہ گئی“ والی بات ہو گئی ہے۔ اب کیا کروں۔ ملتوی کر دوں۔ بری بات۔ جن شریف لوگوں نے پشاور سے چترال کے ٹکٹ کا بندوبست کیا ہے وہ کیا کہیں گے۔ اب چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ایئر پورٹ پر نو بجے کی فلائیٹ نے جب ایک بجے ٹیک آف کیا تو میں نے جی بھر کر بچوں کو گالیاں نکالیں۔ جنہوں نے یہ جاننے پر کہ میں کوچ سے پشاور جانا چاہتی ہوں استہزائیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ پر اب اللہ کا کرم ہے تھوڑا سا اس جندڑی کا بھی خیال کریں کہ جس بیچاری کا آپ نے مشقتوں کی چکی میں پلینے کا حکم کر رکھا ہے۔“ پر یہاں تو وہ بات ہوئی تھی کہ غریبی میں روزے رکھے اور دن بڑے آئے کہ اگر شومی قسمت سے ہم نے اپنے اوپر ترس کھا ہی لیا تھا تو پی۔ آئی۔ اے سزا دینے پر تل گئی تھی۔ پورے چار گھنٹے انہوں نے گرگٹ کی طرح جتنے رنگ اور سیاہیوں کی طرح جتنے بیان بدلے اس کی تفصیل اتنی شاندار نہیں۔ کیا فائدہ زخموں پر نمک چھڑکنے کا۔

بچے جس اہتمام سے میرا ڈولا ایئر پورٹ پر چھوڑ کر گئے تھے سچی بات ہے اس نے بھی میرے پاؤں مقید کر دیئے تھے۔

بہر حال پشاور ایئر پورٹ روڈ پر واقع ریٹائرڈ سکواڈرن لیڈر میر محمد یونس کے گھر کی خاتون خانہ، بیٹیوں اور بہوؤں نے جس محبت، چاہت اور خلوص سے استقبال کیا اس نے شادماں کیا۔ کچھ اس خبر نے بھی از سر نو توانائی بخشی کہ جب خاتون خانہ کے بیٹے نے بتایا کہ اس نے آج کے فرنیچر پوسٹ میں میلے کے منعقد ہونے کی خبر پڑھی ہے۔

چترال ایئر پورٹ پر متضاد خبریں تھیں۔ ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا کی رٹ زیادہ تھی۔ جس نے ایڈوکیٹ کے مچلتے جذبات صابن کے جھاگ کی طرح بٹھا دیئے تھے۔ ان جذبات کے خاتمے میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ خیر سے ڈی سی چترال کی سرد مہری نے ختم کر دی کہ تپتی دوپہر میں جب مار دھاڑ کرتی ہم دونوں خواتین اس سے ملنے ڈیزھ کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے اس کے گھر پہنچیں اپنے دست مبارک سے دو عدد سفر ناموں پر اس کا نام لکھ کر میں نے جانے کیوں یہ سمجھ لیا تھا کہ کتابیں ہاتھ میں تھامتے ہی وہ ہمیں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دے گا۔ ڈرائیونگ روم کا دروازہ کھلے گا مودب خدمت گار کورنش بجالاتے ہوئے ہمیں ہاتھ لہرا کر صوفوں پر بیٹھنے کے لئے کہے گا مشروب اور چائے سے تواضع ہوگی صاحب ہم سے گفتگو فرمائیں گے اور ہمیں اپنے ہر ممکن تعاون کا پکا پکا یقین دلائیں گے۔ پڑیڑھ گھنڈا اثر و ت کے پیر کی کھنی چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے

سو کھنے والی بات ہو گئی تھی۔ جب کسی نے منہ نہ لگایا تو نتیجتاً کپڑے جھاڑ کر اٹھے اور لوٹ کر بدھو ریٹ ہاؤس آئے۔

پہاڑوں میں چھپتی پھرتی شام مجھے بہت افسردہ نظر آئی جبکہ مہر النساء اس سلونی شام پر قربان ہو رہی تھی۔ رات کو پی سی او گئے کہ گھر والوں کو اپنی اطلاع دے دیں۔ آپریٹر بڑا بیباک تھا میں نے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کے بارے میں پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب چترال کی بڑی علمی، ادبی اور تعلیمی شخصیت ہیں۔ اس بار ان سے ملنا میرے پروگرام میں سرفہرست تھا۔ آپریٹر نے بتایا کہ وہ ابھی پانچ منٹ پہلے اپنی بیگم کے ساتھ یہاں تھے افسوس ہوا۔ ملاقات ہو جاتی تو ملنے کے لئے وقت طے ہو جاتا۔

آخر میں ہمیشہ لیٹ کیوں ہو جاتی ہوں۔ تاسف بھرے لہجے میں یہ سوال میرا اپنے آپ سے تھا۔

بہر حال ان کی رہائش کا پتہ چل گیا۔ وہیں دینین میں ہمارے ریٹ ہاؤس کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ اگلی صبح کوئی نوبے ہم نے ان کے دروازے کی گھنٹی بجادی بچہ ہمیں عقبی آنگن میں لے گیا جہاں دھان پان سی ایک حسین عورت جس کے صبح چہرے پر محبت کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی نے اٹھ کر ہمیں گلے لگایا اور بٹھایا۔

”ڈاکٹر صاحب میری ہمشیرہ کو لیکر اسپتال گئے ہیں ابھی آتے ہیں۔“ ہم بیٹھ گئے وہ لوبیا بنا رہی تھیں۔ اردو کچھ نوٹی پھوٹی بول اور سمجھ سکتی تھیں پر ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی چھوٹی بچیاں ماشاء اللہ بڑی ذہین اور فطین نظر آتی تھیں۔

شوخی رنگوں کی کشیدہ کاری سے مزین بستروں پر پچھی سفید چادروں پر ہم کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تھے۔ ان کے طاقوں اور میزوں پر بچی کتابیں پڑھ پڑھ کر بھی ادب سے گئے۔ لوبیا گوشت اور لبوترے نقش نگار والے نان بھی کھا بیٹھے چائے بھی پی لی جب کہیں جا کر ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کا دیدار ہوا۔

”واللہ آپ لیٹ ہو گئیں کہیں کل آ جاتیں تو ہم آپ کو ایسی جگہ لے جاتے اور ایک ایسی ہستی سے ملاتے جس سے ملنا آپ کے لئے بہت مفید ہوتا۔“

گہرے دکھ اور تاسف کی ایک لہر میری قسمت کو پھٹکارتی زمانوں سے اس کی ہیرا پھیریوں اور کج اداؤں کو لعن طعن کرتی بیک وقت ہونٹوں اور آنکھوں کے راستے باہر نکلی جس میں بولتا اضطراب اور چھلکتا تجسس ڈاکٹر فیضی سے بہت کچھ کہہ گیا۔

”گرم چشمہ کی پری خوان سے ملنے گئے تھے۔“

”پری خوان“ میرے استنبہامیہ انداز پر ڈاکٹر صاحب بولے۔

”ہمارے علاقے میں بعض خواتین کو کشف ہوتا ہے ان پر پریاں اور جن آتے ہیں جو

انہیں مستقبل کی باتیں بتاتے ہیں۔“

میں نے تعجب سے یہ سب سنا۔ میں عقیدے کے اعتبار سے بڑی کٹر قسم کی توحید پرست ہوں وہی نہیں جادو وادو پر قطعی یقین نہیں رکھتی۔ یہ اور بات ہے کسی ایسے اللہ والے کی سدا متلاشی رہی ہوں جو دنیا داری کے شیرے میں لٹھڑے میرے اس وجود کو دھو دھا کر کھرا کر دے اور شاہ حسین کے ان شعروں کی عملی تفسیر بنا دے۔ کہ جہاں پہنچ کر بندہ کہے:

تانا تو نہی بانا تو نہی اندر تو نہی باہر تو نہی

لُو لُو دے وچ تو

پریا تو میری طلبِ صادق نہیں تھی اور یا پھر صاحب لولاک لوگوں کا قحط ہے کہ جس کسی کے بارے میں پڑھا اور سنا پھر جب اس کی کھونج میں نکلی تو اقبال کے یہ اشعار پڑھتی واپس آئی۔

الہی یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

عقیدتوں کے چھلکتے جذبات سے پُر الفاظ حروف میں بدل کر نقطوں کی صورت معدوم

ہو جاتے کہ ایسی ایسی خوفناک باتیں سننے کو ملتیں کہ بس نیلی چھت پر نگاہیں جما کر اتنا کہتی:

”کسی کی بھی ضرورت نہیں تیرے اور میرے درمیان پردہ کیسا۔ کوئی ناٹھ اور واسطہ کیوں۔“

یقیناً یہی وجہ تھی کہ میری آنکھوں میں بے اعتباری تھی۔ اور یقیناً ڈاکٹر فیضی نے اسے پڑھا تھا تبھی وہ بولے۔

”پڑھی لکھی تو نہیں مگر انگریزی اردو بول سکتی ہے۔ زبانیں اس پر وارد ہوتی ہیں۔“  
یہ کلمات یہ باتیں کہنے والا کوئی عام آدمی نہیں۔ ڈاکٹر فیضی جیسا صاحب علم انسان تھا۔ لہذا بے اعتباری کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسی تابعدار اور پہنچی ہوئی شخصیت کا دیدار اور اس کی چند گھنٹوں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کیلئے تو چترال کے آٹری کو نے تک جایا جاسکتا تھا۔ گرم چشمہ تو خیر نزدیک ہی تھا۔ ایک بار پہلے جا چکی تھی دوسری بار پھر سہی۔

میری اندر کی بے کلی غالباً پھوٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھی۔ اس لئے شندھو رزیر بحث آ گیا۔

دراصل کارگل میں casualties کافی ہو رہی ہیں۔ ایسے میں میلہ سجانا تو مناسب نہیں لگتا پھر جسے دفعتاً انہیں کچھ یاد آیا..... ”ارے“..... وہ زور سے کھوار زبان میں منجھلی بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ ہمارے پاس بیٹھی چھوٹی سی لٹی کبوتری تیزی سے اٹھی دوسرے کمرے میں گئی اور پل جھپکتے میں ہاتھ میں کارڈ تھاے واپس آئی ڈاکٹر صاحب کارڈ پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

”لاہور کی مرکزی وادی ہرچمین میں بابائے لاسپور گل ولی خان کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے 10500 فٹ پر ہرچمین جائے شادی میں مقامی کلچر کے بیسویں رنگوں سے لطف اٹھائیے۔ وہاں سے شندھو ر جھیل کی ڈرائیو صرف دو، اڑھائی گھنٹے کی ہے۔“

کاغذ فرش پر پھیل گیا اور پنسل ہاتھوں نے تھام لی۔ چترال سے ہرچمین تک کی اہم وادیاں راستوں کے نشیب و فراز پڑاؤ اور خطرناک مقام کی تفصیلات بمعہ نقشوں کے اس پر کھینچ

کنئیں۔

اور جب میں ڈاکٹر فیضی کے گھر سے اٹھی تھی طمانیت اور سرشاری کی لہریں میرے سر پر  
میں سر سے پاؤں تک رقصاں تھیں۔ کسی اجنبی جگہ کسی اجنبی گھر میں بن بلائے وارد ہو جانا تو  
میرے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔

ریسٹ ہاؤس میں جونہی داخل ہوئے ایک نئی افتاد منتظر تھی۔ چونکہ ار نے بتایا کہ جی  
ہمارے اپنے محلے کے لوگ آرہے ہیں۔ کمرے کل تک خالی ہو جانے چاہئیں۔

اب ہم دونوں بیگ کندھوں سے لٹکائے کسی سستے اور اچھے ہوٹل کی تلاش میں نکلیں۔  
چلو یہ بھی غنیمت ہوا کہ زیادہ نچل خواری نہ ہوئی۔ شاہی مسجد روڈ پر شٹی ٹاور ہوٹل کے  
ریشن پر بیٹھے لڑکے بہت پیسے اور مہذب نظر آئے تھے۔ کمرہ اچھا، کرایہ مناسب اور ماحول بہتر  
لگا۔ لڑکوں کو لیس پیسی لگا کر کرایہ میں مزید کمی کروائی۔ شندھور جھیل سے واپسی تک مختصر سامان  
رکھنے کی شرط منوا کر ہم گویا ہلکے پھلکے ہو کر وہاں سے نکلے۔

چور پوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے والی بات میرے ساتھ تھی۔ مفتوں کی  
عادی مفتوں کی خواہش میں ادھر ادھر تاکا جھانگی سے باز نہیں آتی تھی۔ چھ بجے شام  
A.K.R.S.P. والوں سے رابطہ کیا کہ انکی کوئی گاڑی بونی یا مستونج جارہی ہو..... ”جی نہیں  
..... روکھا سا جواب ملا۔“

دوسرا ٹرائل علی الصبح ہوٹل کے سامنے کھڑی پجارو کو دیکھ کر مارا تھا..... ”جگہ نہیں“.....  
سفید چادر میں لپٹی ایک خاتون نے نخوت بھری سرد مہری سے کہا۔

سیدھے جھاؤ پبلک ٹرانسپورٹ میں بیٹھو میاں۔ ہم نے خود سے کہا۔  
ہم تو چاہتے تھے کہ سورج کی کرنیں ہم پر بونی جا کر پھوٹیں کہ سفر لمبا تھا اور اس بات کی  
بھی خاص تاکید کی گئی تھی کہ شوریدہ سر شاہی داس نالے کو سہ پہر سے پہلے عبور کر لینا ضروری  
ہے۔ پر ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ہماری مرضی کی اوقات ہی کیا تھی۔

اب اگلی نشستوں کا کرایہ دے کر ہم گاڑی والوں پر یہ رعب ڈالنے کے ہرگز مجاز نہ تھے کہ جلدی چلو۔ وہ چلے تب جب انہیں محسوس ہو گیا کہ اب لوگوں کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی ہے اور عقب سے چند ایک نے کھوار میں یقیناً ڈانٹ بھی پلائی ہوگی۔

دہنیں سے وادی کاری تک کا راستہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ کچھ کم ظرف بھی تھا کہ بلاوجہ ہی سڑک اور دریا کا بوجھ اٹھا کر بیچارے پہاڑوں کو ایک دوسرے کے گلے لگنے سے روکے بیٹھا تھا وگرنہ وہ بیچارے تو عاشق و معشوق کی طرح لہک لہک کر ایک دوسرے سے جنھیاں ڈالنے کے لئے مضطرب تھے۔ تنگ سی خوبصورت سڑک اور نالے کی صورت لیے دریاے چترال ہی رقیب رو سیاہ بنے بیٹھے تھے۔

کو جو پائین اور بالا دونوں خوبصورت تھے۔

راغ سے کوغذی تک چھوٹی چھوٹی وادیاں۔ چشموں سے نہال بزرے سے مالا مال پھولوں پھلوں سے لدی پھندی دکھائی دیں مجھے یاد آیا تھا اسی وادی کے بارے میں کسی نے کہا تھا کوغذی ضرور جائے۔

میں کدھر کدھر جاواں۔ کوغذی کی مسجد اور مکتب دونوں نے جھک کر داد سمیٹی۔

ایک چھوٹے سے گھر کی چھت پر ایک نوخیز لڑکی کے خوبصورت چہرے نے یوں لشکارا مارا جیسے کوئی برفانی پوٹی سورج کی اولین کرن پڑنے پر لشکارے مارتی ہے۔

دیگن جس تیز رفتاری سے پختہ سڑک پر ڈاک کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگی جاتی تھی۔ اسپر اسے سراہے ابھی چند لمحے ہی ہوئے ہونگے کہ گاڑی کی اچھل کود شروع ہوگئی وادی استملول کے پاس سے تقریباً فرلانگ بھر کا ٹونا سیلاب کی چاہتوں کی نذر ہوا پڑا تھا۔

وادی موری اشٹ کے لوگ معلوم ہوتا تھا اللہ میاں کی چاہت میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں کہ گھر کھیت ٹھلیاں سبھی اسکے پڑوس میں بنا رکھے ہیں۔

دریا کے پار برایت بہت بڑا گاؤں ہے اسی گاؤں کے پہاڑوں سے گرم چشمے کو راستہ

نکلتا ہے۔ گرم چشمے کے ساتھ پری خوان کی تصوراتی شکل آنکھوں کے سامنے ابھری۔

اللہ کی ذات مسبب اسباب ہے جب پیاس ہونٹوں پر تھرکنے لگی جب واش روم جانے کی ضرورت کا احساس ہوا گاڑی برنس میں چائے پانی کے لئے رک گئی۔ سڑک کے کنارے بستا گاؤں جہاں چشمے کا چاندی جیسا پانی کسی آبشار کی صورت میں اس ہتھ چھٹ طریقے سے گر رہا تھا کہ مچھلی کی طرح ہاتھوں کی اوک پر دو گھونٹ کی صورت میں اُسکا نکلتا محال ہو رہا تھا۔ زبان گیلی ضرور ہوئی تھی پر اندر سیرابی سے محروم تھا۔ سامنے گھر تھا جسکے آگے خالی جگہ پر زیونی رنگت والے گندم کے پولے اپنی مخصوص خوشبو نتھنوں میں پہنچا رہے تھے۔

برآمدے میں بچھے چوٹی تخت پر ایک حسین مورت چینی کا پیالہ ہاتھ میں تھامے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اٹھی میرے ہاتھوں کو اُس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما کالے ہاتھوں نے اگر گورے ہاتھوں کے کھر درے پن اور ٹھنڈک کے لمس کو جذب کیا تھا تو وہیں خوبصورت گلابی ہونٹوں سے پھوٹے کھوار زبان کے بیٹھے الفاظ سبز غلانی آنکھوں سے پھوٹی محبت کی روشنی اور سیلے چہرے پر بکھرے اپنائیت بھرے احساسات میرے اندر کو گرمانے کے لیے کافی تھے۔ چوٹی تخت پر مجھے بٹھانے کے بعد وہ چولہے کی طرف لپکی کہ چائے بنائے۔ میں نے لپک کر اُسکا آنچل تھاما جو شوخ ہرے رنگ پر اودے پھولوں سے انا پڑا تھا جسے شوخی و سادگی کو یکجا کر دیا تھا۔ اُسکا شوہر عبدالقدوس چترال سکاؤٹ کا مجاہد ہنسا اور اردو میں بولا۔

”مہمان ہیں چائے بہت ضروری ہے۔“

”چائے کے جھیلے میں پڑے تو باہر گاڑی والے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ مہر النساء بھی

میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ ہاں البتہ پانی ضرور پلا دیجئے۔“

زبان ضرور اجنبی تھی پر گلابی ہونٹوں سے محبت کا اظہار پھوٹ پھوٹ کر ہو رہا تھا۔ اس

اظہار میں میں نے اپنے آپ کو غوطے دیئے۔ ٹھنڈے بیٹھے پانی کے دو گلاس پی کر بھی میری تشفی نہ ہوئی پر میں نے تیسرے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا کہ میرے ساتھ بہت سارے ڈر چمٹے ہوئے

تھے۔ واش روم سے فارغ ہو کر میں باہر آئی تو ویگن کے چیختے چنگھاڑتے ہارن نے چونکا کر دیا۔ محبت بھری جہیمیاں ہاتھوں پر بوسوں کی یلغار اور آنکھوں سے چھلکتے چائے نہ پی سکنے کے تاسف بھرے جذبات نے مہمانداری کی روایت کی عظمت اور افادیت کی مجھ پر لطیف انداز میں عکاسی کی تھی۔ صد ہزار شکر اور احسان اس کلچر اور تہذیب کا کہ جس نے ہمیں ان روایات کا امین ٹھہرایا۔

اجنبی جگہیں اور اجنبی لوگ یادوں کے خزانوں میں یوں جمع ہو جاتے ہیں کہ جب انہیں نکالو وہ لوینڈر کی خوشبو میں مہکتے باہر آتے ہیں۔ ویگن میں بیٹھ کر میں دیر تک اسی سرشاری میں ڈوبی رہی۔

شجر سے چترال کی حد و ختم ہو رہی تھیں اور مستوح کا آغاز ہو رہا تھا۔ لپے لپے پتے گھروں والی وادی ریشن گزری۔ چولہے کی آگ سے سینکی روٹی کو مکھن کے ساتھ تھپیز کر دینے والی خاتون یاد آئی۔ سینگ سے بنے ٹاپس اور فاطمہ نے یاد کے جھروکے سے جھانکا۔ ریشن بہت خوبصورت وادی ہے۔ پھر شوگرام بصارت کی زد میں ابھری۔ ویگن کی رفتار اور ہوائیں بہت تیز تھیں پڑانے منظروں اور یادوں کو بادلوں کی طرح اڑا لے گئیں۔ کوراغ آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اتنی کھلی اور کشادہ پہاڑ تو لگتا تھا جیسے وادی سے روٹھے ہوئے ہوں۔ نظروں سے انکا تصادم کہیں بہت دور جا کر ہوتا تھا جا بجا اُگی جنگلی جھاڑیاں جن پر لہراتے چھوٹے چھوٹے کاسنی پھول۔

دفعاً کسی نے کہا تھا۔ ”بونی آ گئی ہے۔“ میں نے ارد گرد دیکھا اور مہر النساء سے کہا۔

”کہاں“

شاہ بلوط کے سرسبز ٹھنڈوں کے سوا کچھ نظر نہ پڑا۔

کسی پھٹی پڑانی خستہ حال چادر یا بُرقعے کا ایک ایسی کی نقاب اُلٹ جائے اور اندر سے ایک حسین مورت موٹی موٹی آنکھیں پیناتی آپکو اشارے بازی کرتی نظر آ جائے تو آپ سحرزدہ سے اُنکلیاں دانتوں تلے داب لیں گے کچھ ایسا ہی حال میرا تھا کہ معلق پل کو پار کرنے کے ساتھ

ہی اچھی خاصی عمودی چڑھائی کے بعد گاڑی ایک ایسی کشادہ دورو یہ مکانوں سے گھری گلی میں داخل ہو گئی تھی جسکی کچی لپی پتی دیواروں پر پھیلی انگوروں کی بلیں اپنے پُنے منے پھلوں کے ساتھ آنکھوں میں تحیرانہ اور حریصانہ ترغیب دیتے ہوئے زبان کو یہ کہنے پر مجبور کر رہی تھیں کہ ہائے یہ انگور ہیں پر کچے ہیں۔ گھروں میں اُگے پھلدار درختوں کی پھیلی شاخیں گلی کے فرش پر دھوپ چھاؤں کے ساتھ آرٹ کے خوبصورت نقش بنا رہی تھیں۔ گلی سنسان تھی۔ بہت سارا راستہ چلنے کے بعد کشادگی ہوئی اور گاڑی بازار میں داخل ہو کر باغ بوستان ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ نیچے اتر کر دیکھا چھوٹا سا بازار چوڑے چوڑے پٹوں کے دروازوں والی چند دوکانیں جن میں بیٹھے دوکانداروں نے پل بھر کے لئے گردنیں اٹھا کر تو ہمیں ضرور دیکھا پر پھر جیسے اپنے کام میں لگ گئے۔ ایسی بُوڑھی عورتوں کو کون اتنی دیر دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو بات تھی۔

ہاں البتہ ایک نوجوان ایڈووکیٹ سراج علی اور چند چھوٹے بچوں نے بہت پذیرائی کی۔ معلومات فراہم کیں جن میں سرفہرست یہ اطلاع تھی کہ ہر چین کیلئے آپکو گاڑی بک کرنی پڑے گی۔ "A.K.R.S.P" والوں کی کوئی گاڑی ادھر جا رہی ہو؟" میں باز نہیں آتی تھی۔

"مشکل ہے۔ بہر حال پتہ کر لیں۔"

باغ بوستان ہوٹل کے بڑے سے تخت پر قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے ہمارے درمیان یہ مکالمہ ہوا تھا۔

سخت چلچلاتی دھوپ میں ہم نے وادی بونی کو دیکھا جس حسین انداز میں اس وادی نے لشکارے مارے اُسے ہمیں خاصا گھائل کیا۔ A.K.R.S.P والوں کی مینجمنٹ یونٹ میں گئے تو پتہ چلا کہ کل گاڑی گئی تھی آج کا کوئی چانس نہیں اور جب واپسی ہو رہی تھی میرے قدم ٹھٹھک گئے۔

جیسے کسی جنگل میں سنہری گلاب کھلا ہوا ہو..... اتنی شاندار عمارت کہ جسے روکا اور جیسے کہا کہ مجھے دیکھے اور سرا ہے بغیر کہاں جاتی ہو۔ تعارف ہوا کہ یہ اسماعیلی گریٹر کا ہاسٹل ہے۔ دیکھنے کی خواہش پر اجازت ملی۔ سبحان اللہ پھولوں سے لدی پھندی کیاریوں اور عمارت کی

ساخت نے بتایا کہ ویرانے میں مشرقی گلاب نہیں بلکہ مغربی گلاب کھلا ہے۔ فرانسیسی ماہرین کا انداز مہارت عمارت کے کونے کونے سے ٹپک رہا تھا۔ کیا کمپیوٹر لیب، کیا انکے سونے کے کمرے، کیا ڈائیننگ ہال، ٹی وی روم اور لائبریری۔ بے طرح رشک آیا اسما علی لڑکیوں پر ہاتھ روم تک فائو شہار ہونٹوں کو شرماتا ہے۔

وادی بونی کی عشوہ طرازیوں تو باعث تقلید ہیں کہ سترنی صد خواندگی کی شرح ہے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ دونوں کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ کہیں کہیں جماعت اسلامی کے دانے بھی سرگرم عمل ہیں۔ گورنمنٹ سوشل ویلفیئر پروگرام کے تحت لڑکیوں کو سلائی کڑھائی الیکٹریک اور الیکٹریک کے کاموں میں ماہر کیا جاتا ہے۔

باغ بوستان ہونٹ میں بوستان وگلستان والی کوئی بات نہیں تھی۔ پنجاب کے ٹال ہونٹوں والا منظر تھا۔ بڑے سے چوبی تخت پر بیٹھ کر بینگن آلو کا سالن کٹا ہوا پیاز اور گرم تندوری روٹی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایڈووکیٹ سراج علی جس گاڑی والے کو لے کر آئے اُسے اگر پھٹی پڑانی لیراں لگی جینز شرٹ پہنی ہوتی تو سو فیصد ہم اُسے برٹش۔ اٹالین یا اسٹریلین خیال کرتے۔ پراسکے تن پر شلووار قمیض تھی وہ اُردو میں بات کر رہا تھا۔ اور نام تھا اُس کا ارشاد بابا۔

دھوپ کے جاہ و جلال اور رعب و دوب کا تو یہ عالم تھا کہ اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا محال ہو رہا تھا۔ ارشاد بابا نے ایک ہزار مانگا تھا۔ آٹھ سو پر بات طے ہوئی۔ جیپ ضرورت ایجاد کی ماں ہے کی عملی تفسیر پیش کر رہی تھی۔ ماشاء اللہ سارا تانا بانا لوہے کے راڈوں پر کھڑا اور بیٹھا ہوا تھا comfort نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ قبر درویش برجان درویش والی صورت حال تھی۔ صبر شکر کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا سو بیٹھ گئے۔ بونی تک بہت اچھی کارپینڈر روڈ تھی۔ اب کچی سڑک پر سفر شروع ہوا تھا۔ آوی کے بعد چھوٹے موٹے کئی گاؤں گزرے۔

گاڑی اسوقت ڈھلانی چڑھائی پر تھی آگے بلاسنڈ موڑ تھا اور یہ منڈاغ کی وادی تھی۔  
 دفعتاً میں نے نیچے دیکھا۔ ”خدا یا“ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ منظر کسی حسین و  
 جمیل تابناک چہرے کے زخسار پر سیاہ تل کی صورت میں چمک رہا تھا ”گاڑی روکو ارشاد بابا زک  
 جاؤ کہ اس نظارے کو آنکھوں میں جذب کئے بغیر آگے نہیں جایا جاسکتا۔“ سڑک کے کناروں پر  
 پڑے پڑے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے مہر النساء سے کہا ”ذرا دیکھو تو ہر چیز کتنی مناسبت  
 کے ساتھ ایک تناسب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کشیدہ قامت صنوبر کے درختوں کی اونچائی۔ پھلدار  
 درختوں کی متوازی قطاریں۔ چاندی بہاتا دریائے مستوج گھروں کی عمودی چھتیں۔ گندم کے  
 زعفرانی کمیٹوں کے سلسلے پس منظر میں سیاہ پہاڑوں پر جمی برف نیلا آسمان اسپر چمکتا سورج اور  
 لطیف ہواؤں میں جھولتی جھومتی ہر شے۔“ میرا جی وہاں ساکت ہو جانے کو چاہتا تھا۔ لمحے بیت  
 گئے۔ میری آنکھوں میں چھلکتی دید کی ہوس کسی طرح سیر نہیں ہو رہی تھی بس نہ چلتا تھا کہ کیسے اس  
 سین کو اٹھا کر آنکھوں کی پتلیوں میں منجمد کر لوں۔ چونکی، ارشاد بابا نے کہا۔

”اب چلیئے آپنے چائے کے لیے بھی رکنا ہے اور داس نالے کو دن کی روشنی میں پار  
 بھی کرنا ہے۔“

میرا گرام نمبر ۱ سے گزرتے ہوئے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کل اس وادی میں آنے یا  
 نہ آنے کے بارے میں میں گوگلو کا شکار رہوں گی۔

پرواک نوروز ہوٹل میں چائے کے لئے رُک گئے۔ چائے ذائقہ دار تھی۔ ہوٹل کے  
 چہوٹے سے کمرے کے سامنے چار پائیاں پچھی تھیں تیز ہوائیں اب تمازت سے نکل کر لطافت کی  
 حدوں میں داخل ہو رہی تھیں اور جسم و روح کو سرشار کر رہی تھیں۔ ایسے میں چائے کے گرم گھونٹ  
 کتنی بڑی نعمت خداوندی تھے۔

”دیکھئے اپنی دائیں جانب“ ارشاد بابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میری  
 آنکھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں میں چاندی کی طرح چمکتا طویل و عریض دریائے یار

خون دریائے لاسپور سے گلے مل رہا تھا وصال کا یہ منظر بہت دلفریب تھا۔

مجھے یاد آیا تھا۔ چترال میں کسی نے کہا تھا مستونج ضرور جانا بہت خوبصورت وادی ہے۔ پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی یہاں شاندار موٹل بنا رہی ہے۔ مہتروں کا قلعہ گو بڑھاپے کی شکستہ حالی سے دوچار ہے۔ پر پھر بھی جوانی کی رعنائی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ درہ بروغل کو راستہ مستونج سے ہی جاتا ہے۔ مستونج کو میں کہنی مار کر آگے بڑھ رہی تھی۔

ارشاد بابا بتا رہا تھا۔ ”وادی یارخون کے پاس واقع درہ بروغل پاکستان کو تاجکستان

اور چین سے ملاتا ہے۔“

بروغل درے کے ذکر نے گویا مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ کاش میں اس درے سے سفر کرتی ہوئی واخان جا نکلتی ان سب لوگوں سے ملتی جو ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے کسی طرح بچ چکا کر بروغل کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ بہت قانع، فطرت کے قریب یہ معصوم سے لوگ جنہیں موسم کی سختیاں رزق کی تنگیاں کچھ بھی پریشان نہ کرتیں۔ موسیقی جکا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جو شدید طوفانی موسموں میں اپنے اونی خیموں میں جلتی آگ کے گرد بیٹھ کر رباب بجاتے ہوئے قدیم فارسی کی غزلیں اس ترنم سے گاتے ہیں کہ بندے کا سانس رکنے لگتا ہے۔

میں واپسی پر مستونج رکوں گی۔

میری سیاحت کی تشنہ آرزوئیں میرے اندر سے نکل کر باہر سڑک پر برہنہ پا مجھے اُکسانے لگیں۔

جانے کن جتنوں سے تسلیوں کے پیرہن پہنا کر میں نے انہیں قابو کیا۔

دریائے لاسپور کے کنارے چھوٹی سی وادی شہید اس میں گاڑی شاید خراب ہی اسی لیے ہوئی تھی کہ اُس گھر میں اُگے پھلدار درخت جانے کب سے ہمارے نام کی خوبانیاں اور شہوت اپنے ہاتھوں میں سنبھالے کھڑے تھے۔ گاڑی سے اتر کر میں ہنستے مسکراتے کہ ”چلو ایک

اور گھر کو دیکھیں گے، والے احساسات لئے اسماری خان کے گھر داخل ہوئی تھی۔ اس گھر کے عمر رسیدہ مرد عظیم خان نے جس محبت سے خوش آمدید کہا اس گھر کی خاتون اور بچوں نے جس انداز میں ہمارے لیے دیدہ و دل فراش کیئے خدا گواہ ہے اسکی یاد آج بھی میری آنکھوں میں کسی خوشگوار پھوار کی صورت میں اتر کر نہیں گویا کر دیتی ہے۔ ارد گرد پس و پیش کی ساری زمین اس خاندان کی تھی جسکا سربراہ سعودیہ میں تھا۔ مہمان خانہ جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا مگر اصلی چتر الی گھر اپنی روایتی آن بان کے ساتھ ہو بہو ویسا ہی تھا۔ الٹی کون کی صورت درمیان سے نکلی چھت ایک فٹ چوٹی تختوں سے چار حصوں میں منقسم کمرہ جہاں بچھی پرالی پر رکھے گدوں پر حسب مراتب گھر کے افراد کے بیٹھنے اور لیٹنے کے انتظامات۔ وسط میں جلتا چولہا۔

ہم باہر آ گئے تھے۔ مجھے نماز پڑھنی تھی۔

مہمان خانے کے عین سامنے باغ میں خوش رنگ پھول کھلتے تھے۔ دبیز گھاس کا قالین کہ جس پر نماز کے لئے کپڑا بچھانا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی معصوم صورت بچے کی معصومیت پر شک کیا جائے۔ نماز میں نے اسی قدر تی قالین پر پڑھی اور جب دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سامنے پر ہیبت پہاڑ کچھ یوں نظر آئے جیسے میرے ماتھے سے اپنا ماتھا لڑا دینا چاہتے ہوں۔

جب کھڑے ہو کر رخ پھیرا تو باغ میں کرسیاں بچھ چکی تھیں۔ کشیدہ کاری سے مزین میز پوش پر رکھی خوبانیاں اور تو توتوں کی صورت انکار سیلا پن ذائقہ اور خوشبو سبھی نظر و دہن کو لپچار ہے تھے۔ شام کی ٹھنڈی ہوائیں فضا کو جنت بنانے کی پوری تگ و دو میں تھیں۔ پہاڑوں کے بے ہنگم سلسلے نے اگلے منظر کو آشکارا ہونے سے روک دیا تھا۔ پشت پر سیاہ بلندو بالا پر ہیبت سلسلے اندھیرے کی چادر اوڑھ کر خود کو اور زیادہ خوفناک بنا رہے تھے پر سامنے کی چوٹیوں پر جیسے سورج سونے کے تھال پر تھال لٹا رہا تھا۔

ہرے بھرے تروتازہ سہ طرف پھیلے سبزے سامنے کیاریوں میں اُگے پھول اور زعفران کے پودوں کی دید نے جیسے میری آنکھوں کی ساری تھکن کو بلائنگ پیپر کی طرح جذب

کرتے ہوئے اُسے تازگی اور فرحت کا احساس بخشتا تھا۔

سڑک سے بہت نیچے روانیوں سے بہتا دریائے لاسپور کا شور اس خاموشی سے پُر  
سنائے میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

رس بھری خوبانیاں جو نہی زبان پر رکھیں بے اختیار میری نگاہوں نے نیلے وسعتوں  
بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تو نے کیسے مالا مال کر رکھا  
ہے۔

سماٹ رہنے اور نظر آنے کا شوق خود ہی ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی لگام دے  
ڈالتا ہے۔ مہر النساء اگر یہ اظہار نہ بھی کرتی کہ خوبانیوں کی زیادتی پیٹ کو اپ سیٹ کرتی ہے میں  
نے چند دانوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لینا تھا۔

پھر جیسے اُس خاموشی سے گھر میں اچانک ہی چادروں میں لپٹی چند عورتیں اور تیلیوں  
کی طرح ہنتے مسکراتے رنگین کپڑوں کی صورت میں رنگوں کی پچکاریاں اڑاتے خوبصورت گل  
گو تھنے سے بچے چھوٹی سی راہداری پر جسکے دونوں اطراف چھوٹی سی باڑتھی پر مینڈکوں کی طرح  
بھدکتے نمودار ہوئے۔ یہ اسماری خان کی بھانجی اور انکی چھوٹی بہنوں کے پر یوار تھے۔ تحریم رحمان  
زچگی کے بعد بچہ گود لے کر پہلی بار انکے ہاں آئی تھیں۔ دنیا میں وارد ہونے والے اس نئے مہمان  
کو ہم دونوں نے اشتیاق سے دیکھا۔ پیارے سے بچے کی ساری پیشانی اور رخسار بکری کے جلے  
سینگوں کی راکھ سے بنائے تلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ مقامی کلچر کا ایک حصہ ہے جسے ہر  
پیدائشی بچے کی رو میں صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کبھی پنجاب میں آٹے کی  
مروڑی بنا کر نوزائیدہ کے چہرے پر روؤں کی صفائی کے لئے رگڑا جاتا تھا۔

آنے والی یہ فیملی پڑھی لکھی تھی۔ تحریم رحمان ہر چین سے آگے بروک سکول میں  
پڑھاتی تھیں۔ سوغات کے طور پر آنے والے مہمان سنا باچی کی ڈش بنا کر لائے تھے۔ نمکین پنیر اور  
زعفران کے آمیزے سے بنا ہوا یہ کھانا ہمیں بھی چکھایا گیا۔ اب دہن اس ذائقہ سے نا آشنا بھلا

کیا لذت لیتا۔

مگر یہ پلیٹ جب ارشاد بابا کو پیش کی گئی میں نے دیکھا تھا رغبت، شوق اور والہانہ پن اُسکے چہرے اور ہاتھوں کے ایک ایک عضو سے ٹپکا تھا۔ وہ مزے سے اُسے کھا رہا تھا اور اب اُسے نہ داس نالے کا فکر تھا اور نہ شام گہری ہونے کا۔

سچی بات ہے داس نالے کو دیکھ کر تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا

”اللہ ارشاد تم نے تو اسے ہوا بنا دیا تھا۔“

اور جو بابا ارشاد بابا نے بھی طنز یہ ہنکارہ بھرا۔ ”جی ہاں آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آج کل اسکے بہاؤ میں اتنی شدت نہیں وگرنہ یہ اگر بھر جائے تو یادگار سبق سکھا جاتا ہے۔“ لاسپور اور رمن کی وادیوں کے درمیان دہنی طرف کے پہاڑ کس قدر سیاہ، پُر ہیبت اور خوفناک تھے۔ انکی چوٹیوں پر چمکتے جلوے دکھاتے برف کے تودے جس انداز میں نیچے آ رہے تھے انے تجریدی آرٹ کی کئی صورتیں بنا ڈالی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کلاشکوفوں سے لیس کمانڈوز سیاہ ڈانگریاں پہنے قدرت کے ان عجوبوں کی حفاظت کیلئے پہرے پر مستعد ہوں۔ خدا گواہ ہے اس منظر میں اتنی وحشت تھی اور میں اسی طرح لرزی تھی جیسے ہیگر ڈکشی کا ہوراس ہولی پراسرار دنیا کی خوفناکیوں پر لرزتا تھا۔

اور جب سے ہمک ہمک کر جھپٹے کی گود میں جانے کے لئے چل چل پڑ رہا تھا اور لاسپور کی مرکزی وادی ہر چین ہماری نظروں میں تھی گاڑی پنکچر ہو گئی تھی۔ چلو پنکچر ہونے والی کسر باقی رہ گئی تھی سودہ بھی پوری ہوئی۔

میں تو باہر پتھروں پر بیٹھ کر فطرت سے باتیں کرنے لگی۔ ہاں البتہ مہر النساء نے فی الفور اپنی خدمات پیش کیں دراصل خود ڈرائیو کرنے کی وجہ سے مہر النساء ان تجربات سے گزرتی

رہتی ہے۔

دو ڈھائی کلو جیک نے پل بھر میں منوں وزنی گاڑی کو اپنے اوپر یوں اٹھالیا جیسے ہمارے ہاں کی عورت سسرال کی سیزھی چڑھتے ہی پوری گھر ہستی کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیتی ہے۔

گل ولی خان کے گھر کی چڑھائیاں چڑھنے سے قبل دورویہ درختوں کی چھتھنار سے گزرتے ہوئے فضا نے اندھیرے اور رات پڑ جانے کا تاثر دیا پر جب ڈھیلی ڈھالی انجر پنجر ہلی جیپ قلقاریاں بھرتی پھرتیوں سے چڑھائیاں چڑھ کر وسیع و عریض بزرے سے لدے پھندے قطعے میں جا کھڑی ہوئی تو ٹیٹھے ٹیٹھے اُجالے میں گھاس کے وسیع و عریض قطعے سیبوں کے باغ درختوں سے بندھے لکڑی کے ڈنڈوں سے چمٹے بجلی کے ققمے، گیٹ ہاؤس کی عمارت اسکے بزر دروازے اور لان میں پچھی بے شمار سرخ و نیلی کرسیاں جو اپنی موجودگی سے یقیناً کسی ہنگامے کسی تقریب کے انعقاد یا خاتمے کا پتہ دیا کرتی ہیں جیسے مناظر نے بصارت کو اتنی رعنائی اور دلربائی دی کہ ساری تھکن اڑنچھو ہو گئی۔

نوشے میاں برخوردار قسم کا رعنا جوان تھا۔ اُسے جس انداز میں ہماری پذیرائی کی اور جو الفاظ کہے انہوں نے مجھے پنجاب کے کسی گاؤں کی پوپے منہ والی مشفق سی بوڑھی عورت کی یاد دلائی جو اپنی دلہیز پر کھڑے کسی اجنبی کو جم جم آیا، جی صدقے ست بسم اللہ کہتے ہوئے اُسے ہاتھ سے تھام کر اپنے کشادہ آنگن میں پچھی سوتری چارپائی پر بٹھاتی ہے پھر بیٹی یا بہو کو لسی لانے کے لئے آوازیں دیتی ہے مہمان اگر خفت کا اظہار کرے تو کہتی ہے ”پھوٹ پتر بستے رستے گھروں میں مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔“

گیٹ ہاؤس کا کمرہ راحت اور آرام کے سبھی سامان سے لیس تھا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جب رُخ پھیرا تو ٹرے میں بھی چائے اور سکٹ دو لہے میاں کی محبت بھری باتوں کے ساتھ منتظر تھے۔ دولہا پشاور یونیورسٹی کا پوسٹ گریجویٹ تھا میرا گرام نمبر اکی جس دلہن کو بیاہ

کر لارہا تھا وہ بھی ماشاء اللہ ایم۔ اے اسلامیات تھی اور کسی سکول میں پڑھاتی بھی تھی۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔

رات کے پہلے پہر جہاں نشست جمی وہ چترالی گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جسکی کچی دیواریں نفاست سے لپی پتی تھیں۔ گل ولی خان جنہیں بابائے لاسپور کہا جاتا ہے بلا مبالغہ ساڑھے چھ فٹنی قامت پر آریائی نقش و نگار لئے خاصی مہربان اور حلیم سی شخصیت نظر آئے تھے۔ انہیں بخار تھا اور وہ حیرت زدہ سے تھے کہ انکا پنڈا تو زندگی بھر بیماری یا تپ نام کی ایسی چیزوں سے نامانوس رہا ہے کل بیٹے کی بارات ہے بھلا ایسے سے تن پر اس اجنبی مہمان کا کیا کام۔

ہم ہنس پڑے تھے صاحب خانہ جتنے قوی الجبہ تھے خاتون خانہ دولت بیگم اتنی ہی ضعیف الجبہ تھیں چہرے پر زمانے بھر کی ملائمت اور نرمی گھلی ہوئی۔ گل ولی خان سے میرے اس سوال پر کہ کچھ یہاں کی تاریخ کا تذکرہ ہو جائے انکے نمبر دو بیٹے نے نخوت سے کہا۔

”چھوڑیے جی تاریخ میں کیا پڑا ہے۔“ اور کھٹ سے ٹی وی آن ہو گیا۔ انڈیا کی پارلیمنٹ کا افتتاحی اجلاس ہو رہا تھا۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں اور دنیا واقعی گلوبل ویج کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ 10500 فٹ کی بلندی پر بیٹھی میں پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے دیکھ سکتی تھی۔

باہر گاؤں کی عورتیں دورویہ قطار میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں میرے باہر نکل کر انکے ساتھ بیٹھنے اور کھانے کی خواہش کو انکے نمبر دو بیٹے نے پذیرائی نہیں دی۔ کمرے میں باتوں کا سلسلہ خاصا کھلا ڈلا تھا۔ بیٹوں کو باپ کی دوسری شادی پر بڑا اعتراض تھا۔ بابائے لاسپور بھی اپنی اس غلطی پر متاسف سے نظر آتے تھے۔

دستر خوان پر کھانا رکھنے آفتابوں سے ہاتھ دھلانے اور کھانے کے دوران سب سے بڑا بھائی امیر اللہ خان زیر بحث تھا جسے گھر بدر کیا ہوا تھا وجہ بس یہی اسکی دوسری شادی تھی شاید گل ولی خان اپنے تلخ تجربے سے اولاد کو گزارنا نہیں چاہتے تھے مگر اب اسکا کیا علاج اے چارہ گر۔

پھر کہیں جیسے دور سے ہواؤں کے دوش پر لہراتی بل کھاتی سرنی اور ڈھول کی آوازیں

اُس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر ہماری سماعت سے ٹکرائیں میں نے دیکھا تھا گل ولی خان کے ہونٹ انکا چہرہ انکی آنکھیں بڑی مسرت اگیں پھوار میں جیسے نہا گئے ہوں۔ مقدر کے بغیر اولاد کی خوشیوں کی تکمیل نہیں دیکھی جاتی یقیناً وہ بختا اور تھے۔

میرے تو بے حد چہیتے کزن اور دیور کو یہ سب دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ عین جوانی میں بھریا میلہ چھوڑ کر یوں چلے گئے جیسے وہ بس دنیا میں ہاتھ لگانے ہی تو آئے تھے۔

پھر یہ محفل برخاست ہوئی کہ انہوں نے کہا آپ اب جائیے اور رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہوں آپ کے ساتھ اب کل نشست ہوگی۔

باہر ہولناک تاریکی تھی مہر النساء بس مجھے ایک ہیولے کی صورت نظر آ رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ جو عورت بطور گائیڈ ساتھ تھی اسکے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی اور وہ خاصی تیز طرار بھی تھی۔ وگرنہ اس رات کھائیوں کھالوں میں گئے گوڈے ٹوٹنے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ کھالے کو چھلانگ لگا کر پار کرتے ہوئے ایک بار تو دھڑام سے گری بھی بس شکر کہ بیچ بچاؤ ہو گیا کیونکہ خاتون نے پھرتی کے ساتھ مجھے سنبھال لیا تھا مہر النساء پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی قائل ہے اسلئے اُس کے ساتھ ہمیشہ خیریت رہتی ہے۔

بجلی کے ققمے ان قطعوں پر پھیلی رات کے چہرے پر پڑی دبیز نقاب کو سرکانے میں بس اتنے ہی کامیاب ہوئے تھے کہ کچھ کچھ چہرہ شناسی ہو رہی تھی۔

لوگوں کے ہجوم سے کچھ یوں دکھتا تھا کہ جیسے راگ و رنگ کی اس محفل سے محفوظ ہونے کے لئے ساری وادی اکرٹھی ہو گئی تھی معززین کرسیوں پر اور اور لڑکے بالے گول دائروں میں بیٹھے یا کھڑے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کی ڈھلانی شیڈوں پر لڑکیاں اور چھتوں پر رنگین اور سفید چادروں میں لپٹی عورتیں مٹے مٹے جلوے دکھا رہی تھیں۔ سازندے ڈھول، سرنی اور ڈاما بجا رہے تھے۔ اور زرگار احمد خان گول دائرے میں چکر کاٹتے ہوئے ہاتھوں سے اشارے دیتا نہیں ہدایات دے رہا تھا۔

اس رات میں نے موسیقی کی خوبصورت دھنیں سنیں ان دھنوں پر رقص ہوتے دیکھا۔  
 مقامی معیار کے حساب سے خوش بکین دھن اگر نرم ہندی کے سبک خرام پانیوں کی طرح دھیمے مزاج  
 والی تھی تو ساؤز اتنی تیز تھی کہ اسپر رقص کرنے والا گروپ ٹھنڈ کے باوجود پسینہ پسینہ ہوا ہوگا۔  
 بروازی کی دھن پر اکیلے رقص بھی دیکھا اور روایتی چوغوں کے ساتھ تین آدمیوں کا بھی۔ پھر بڑی پر  
 سوزی دھن بجنی شروع ہوئی۔ دنی کی مشہور شب دراز دھن۔ کسی نے بتایا تھا۔ شوقے اور  
 ٹوبیوں میں بارہ لوگوں کا ایک گروپ دھیمے دھیمے ناچ کے انداز میں قدم اٹھاتا دائرے میں  
 داخل ہو کر دائرے میں مجسم ہوا۔ انکی ہم آہنگ زبان میں ایک گیت فضا میں بکھرا اور رقص شروع  
 ہوا۔ کبھی تیز کبھی مدہم کبھی اوپر کبھی نیچے۔ کھلے آسمان تلے ملگجی روشنیوں میں رات کے اس پہر یہ  
 سب کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔

میں سر شام سونے کی عادی دو بج گئے تھے محفل اپنے جو بن سے اختتام پر اتر رہی تھی۔  
 نیند نے مڑی کی طرح میری پتلیوں پر جالا بٹنا شروع کر دیا تھا بارہ سالہ نیرہ نے ہاتھ پکڑ کر رہبری  
 کی اور یوں میں خواب گاہ تک آئی۔ ماشا اللہ مہر النساء جانے کب کی کمرے میں آ کر بے لطف نیند  
 کے مزے اڑا رہی تھی۔

بستر آرام دہ تھا۔ رضائی نئی تھی شاید اسی لئے میں نے تکیے پر سر رکھا اور پل جھپکتے میں  
 کسی چھوٹے سے بچے کی طرح نیند کی بانہوں میں چلی گئی۔ حسب معمول بہت سویرے آنکھ کھل  
 گئی۔ مہر النساء نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ ہاتھ روم میں پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ وضو تو بس  
 گیلے پانی کا ایک طرح تیمم ہی تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے میں نے اپنے آپ سے کہا۔  
 ”نماز تو میں کھلے نظاروں کی چھاؤں میں ہی پڑھوں گی۔“

دروازہ کھول کر باہر آئی۔ جس جگہ رک کر میں نے گرد و پیش کو دیکھا تھا مجھے محسوس ہوا  
 تھا کہ جیسے میرے قدموں کو کسی نے جکڑ لیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کائنات کے رب نے جتنی پاکیزگی  
 اور حسن کائنات کو بخشا ہو اس کا عشر عشر بھی یہاں نہ ہو پر ان نظاروں کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی نگاہوں

کی کثافت اور آلودگی کا احساس ہوا تھا کہ وہ فی الفور کانپ کر جھک گئیں شاید ڈرتی تھیں کہ انکا میل اپن فضا میں تحلیل ہو کر اُسے آلودہ نہ کر دیں۔ میں نے گھاس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا تھا شدت جذبات سے میرے آنسو نکل پڑے تھے۔ پھر میری نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر اٹھیں انہوں نے شفاف نیلے نکور آسمان کے اُجلے پن میں ایک شان استغنادیکھی پہاڑوں کے سینوں سے اُمنڈتا دبدبہ اور رعب زمین کے سینے پر پچھی گھاس، پچھوا کا ہولے ہولے ہلکوروں کے ساتھ چلنا اور کشیدہ قامت درختوں کا بانگین۔ فضا پر چھایا سناٹا جسے توڑتی چشمے کی مسلسل نغمہ بار آواز۔  
مجھے نیگور کی وہ نظم یاد آئی تھی۔

آ اے خدا آ تو میرے گھر آ

اُس وقت میرے جسم کا نوٹو اوپر والے کو اندر آنے اور اسے اس گھر میں رہنے کی دعوت دے رہا تھا۔

پر اس اوپر والے کو تو بھرے پرے گھروں سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ یہ تو ڈھنڈار گھروں میں رہنا چاہتا ہے۔

آنسو ضرور بہے پر روح کے زنگ کو اتارنا بڑی کٹھنائی کا کام ہے مجھ جیسی کامل اور آرام طلب ایسی مشقت کی بھلا کہاں عادی۔ 'میں میں' کہیں آسانی سے جان چھوڑتی ہے۔ اپنے آپ کو گرم چادر میں لپیٹتے ہوئے میں نیچے اتر آئی تھی۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے عقب سے بھیڑ بکریوں کا ایک لمبا چوڑا ریوڑ آتے دیکھا رک کر میں نے انہیں راستہ دیا ادھیڑ عمر کا مرد پیچھے تھا اور دونو جوان بچے درمیان میں تھے ٹھہر کر سوال جواب کئے جنہوں نے یہ بتایا کہ "یہ سب ڈھور ڈنگر شندھور جھیل کی چراگا ہوں میں جا رہا ہے" "کتنی دیر میں پہنچیں گے وہاں؟" شندھور جھیل کے نام پر میرا اشتیاق قابل دید تھا۔

"شام کو" جواب ملا تھا۔ بچے نے اچھی ترجمانی کی تھی

ڈیڑھ میل کی واک کے دوران میں نے چار ایسے بھرپور ریوڑ شندھور جھیل کی

طرف رواں دواں دیکھے۔ یہ مقامی دستور ہے کہ گرمیوں میں جانوروں کو چراگا ہوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کہیں رکھوالے یہ کام کرتے ہیں اور کہیں لوگ خود اپنی اپنی ذمہ داری پر۔ اکتوبر کے آغاز میں نیچے آ جاتے ہیں۔

میں جب برآمدے میں کرسی پر آ کر بیٹھی دھوپ کے زنگار رنگ چونیوں اور درختوں کے بالائی حصوں کو سونے میں ڈبو چکے تھے۔ صنوبر کے پتروں کے پتے ہوا سے دھیرے دھیرے یوں مل رہے تھے لگ رہا تھا جیسے شہر کے کسی نیون سائن کی بتیاں پل پل میں جلیں بجھیں۔ جیسے کوئی عاشق معشوق کو دلربا انداز میں بلائے۔

بہت دیر گز رگئی میں پتوں کے اس دلچسپ تماشے میں کھوئی رہی اور چونکی تب جب ایک جیپ میں چند غیر ملکی اسی جگہ اتر کر کھڑے ہوئے جہاں رات ہم اترے تھے۔

سوشل لبرل اور ایک پُر اعتماد پاکستانی خاتون ہونے کا مظاہرہ کرنے کے لئے میں فی الفور انکے پاس جا پہنچی۔ یہ سب جاپانی تھے گوپس اور یاسین کے راستے شندھور پہنچے اب حیرال جار ہے تھے۔ Kojima غالباً اُن کا لیڈر تھا۔ عجیب سُن و نہ قسم کی چیز تھی بے جان تاثرات سے خالی سپاٹ چہرہ۔ بات چیت پر آمادہ ہی نہ تھا جاپانی ہمیں پسند سہی پر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہم یونہی جھولی چُک بنے رہیں۔ مایوس ہو کر قدموں کو زنان خانے کی طرف بڑھا دیا۔

جس آنگن کی وسعت اور کشادگی شب میں ظاہر نہ ہوئی وہ صبح کی روشنی میں پوری طرح نمایاں تھی۔ انگنائی میں عارضی بنائے گئے چولہوں پر دیکھے اور دیکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور آگ کے الاؤ دہک رہے تھے۔ داخلی دروازے کے ساتھ بنے کچے برآمدے کے کونے میں بچھے بستر پر گل ولی خان موٹی رضائی اوڑھے نیم دراز ملازموں کو ہدایات دے رہے تھے۔ سلام و دعا کے بعد ہاتھ ملائے گئے اور میں چار پائی کے ساتھ دھری کرسی پر بیٹھ گئی۔

گل ولی خان کے والد لیغنینٹ ولایت خان انڈین آرمی میں تھے۔ سکر دو کی جنگ آزادی میں نمایاں رہے۔ دلیری اور شجاعت گل ولی خان کو وراثت میں ملی۔ علاقے کی تعمیر و ترقی

کے سلسلے میں انھوں نے بتایا ”چترال ایریا ڈویلپمنٹ پروجیکٹ اور آغا خان رورل سپورٹ پروگرام AKRSP کے اشتراک و تعاون سے خاصا کام کر رہے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت بہت توجہ چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے کے کچے راستوں کو ابھی تک پکا نہیں کیا گیا۔ لواری سرنگ ہنگامی بنیادوں پر حل طلب مسئلہ ہے۔“

مذہبی رواداری کے وہ بہت قائل ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے خود آغا خانی ہیں مگر بی بی سنیوں میں بیاہی ہے۔

جب میں گیٹ روم میں آئی مہر النساء برآمدے میں بیٹھی ملازموں کی فوج کو سامنے والے مہمان خانے میں مہمانوں کو ناشتہ کرواتے دیکھنے میں محو تھی۔ ”تمہیں چائے کی طلب ہو رہی ہے شاید؟“ میں نے اسکی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

”ہاں مگر وہ ہمیں توجہ نہیں دے رہے ہیں“ اُس نے نوکروں کا گلہ کیا۔

”خیال رہے ہم بڑے روایتی گھر کے مہمان ہیں جہاں ہر صورت ناشتہ پہلے مردوں کو دینا ہے آؤ کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“

ہماری باری بھی آگئی۔ نُہنا ہوا گوشت خستہ شاپیک (خمیرہ پراٹھا ٹائپ چیز) چھٹی اور چائے۔

اور پھر جیسے سورج نے گھلے ہوئے سونے کا تھال اٹھا کر وادی پر پھینک دیا۔ کہ ہر چیز سہرے پن میں نہا گئی۔ جولائی کی یہ صبح اپنے اندر مہربان اور شفیق ماں جیسی نرمی گرمی سموائے تھی اور یہاں وسیع و عریض لان میں رنگین کرسیوں پر بیٹھے سرخ و سفید بوڑھے نوجوان پس منظر میں بجتی پون وار کی دلنواز دھنوں پر محظوظ ہوتے ہوئے باتوں میں مگن تھے۔

پھر وہاں تیس پینتیس کے ہیر پھیر میں درمیانی قامت والا ایک چاق و چوبند مرد جسکے تن پر سیاہی مائل گرم سوٹ سر پر موٹے رنگ کی چترالی ٹوپی اور اس ٹوپی پر لہراتا، بل کھاتا، جگمگاتا مرغ زریں کا پر کچھ یوں چھب دکھا رہا تھا جیسے مس یونیورس کے سر پر تاج۔

یہ گل ولی خان کے بڑے صاحبزادے امیر اللہ خان تھے۔ چترال ڈسٹرکٹ کونسل کے ممبر اور علاقے کے کونسلر۔ بڑی زندہ دل شخصیت میں نے پوچھا۔  
 ”آپ ہمیں کل نظر نہیں آئے یہاں نہیں رہتے کیا؟“

”آپ نے دیس نکالے کا لفظ تو ضرور سنا ہوگا سمجھ لیجیے مجھے گھر نکالا ملا ہوا ہے۔“ میں انکی بات سمجھ تو گئی پر انجان بنتے ہوئے بولی تھی ”ارے وہ کیوں؟“

”یہ دل ایک لڑکی پر آ گیا تھا باپ اور میرا خاندان میرے دل کا خون کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے اس ہنستے مسکراتے آدمی کو دیکھا جو اس سے مجھے بہت دلچسپ نظر آیا تھا۔

دھوپ جب درختوں کی چوٹیوں اور شاخوں سے لڑھکتی تنوں پر کدکڑے لگاتی آنگن میں پھیل گئی تب راتھنی (چترالی گھر) کے سامنے کچے برآمدے میں معززین اور باہر سے آنے والے عزیزوں کی دورویہ قطاروں کے درمیان دسترخوان پر سنا گاچی اور اشپری سے تواضع کی جانے لگی۔ لڑکیاں چہروں پر پورو (پھاڑی جڑی بوٹیوں سے بنایا جانے والا اُٹن) لگائے مجھے ان خانہ بدوشوں جیسی نظر آئیں جو ماتھے ٹھوڑی اور رخساروں کو مار نیلا بنائے رکھتی ہیں۔ اس پورو کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ اسکا پیٹ لگانے سے چہرہ شاداب اور تروتازہ ہو جاتا ہے۔ عورت کہیں کی بھی ہوا اپنے سنگھار کے لئے سامان ڈھونڈ نکالتی ہے۔

اگر باہر معزز مہمان سنا گاچی اور اشپری سے کام و دہن کی تواضع میں مصروف تھے تو وہیں اندر راتھنی کے بند اور تاریک کمرے میں گاؤں کی عورتوں میں عنابی مائل سرخ سیبوں پر چھینا جھینا جھینا جھینا خوبصورت منظر تھا۔ سامنے دیوار میں گڑی چوبی الماری سے ایک خاتون سیب پھینکنے اور کیچ کروانے میں جتسی ہوئی تھی۔ میں نے فی الفور اس منظر کو کمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنا چاہا تب گل ولی خان کا منبھلا بیٹا وہاں داخل ہوا جس نے کھوار زبان میں انہیں ایک منٹ کا ایسا لیکچر دیا کہ انکے سروں پر بچی شوخ رنگوں کی ٹوپیاں جنکے دھنک رنگ عکس انکی آنکھوں میں بھی جھلک رہے تھے غائب ہو کر سرا سیمگی پھیلا گئے۔ دھمکا چوکڑی کی اڑتی گرد پر تنبیہ کے چند لفظوں کے

پانی نے اُسے فی الفور یوں بٹھا دیا کہ مجھے دکھ ہوا۔ میں لفظ نہیں سمجھی پر مفہوم ضرور سمجھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے بتاؤں کہ یہ چھینا جھپٹی تو ہماری فطرت اور تربیت کا ایک حصہ بنا ہوا ہے ہم نے تو سیرت کا نفرنس جیسی مقدس تقریبات میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کو کھانے پر یوں جھپٹتے دیکھا ہے جیسے یہ انکے مقدر کا آخری کھانا ہو۔

سچی بات تو یہ تھی کہ سب تو میں بھی کوئی کیچ کرنا چاہتی تھی کہ ان عنبری سیبوں کو دیکھ کر میرا منہ بھی پانی پانی ہو رہا تھا۔ پر کھیل تماشا ہی ختم ہو گیا تھا۔

اب ہم نے وادی کا ایک چکر لگانے کا سوچا۔ کسی گاڑی والے کا اتہ پتہ بھی پوچھنا مطلوب تھا کہ جو ہمیں شندھور جھیل لے جاتا۔ ہمارا ارشاد بابا تو خیر سے جا پانیوں کو لے کر چلا گیا تھا۔

جھرنوں کا شور دریا کے پانی کا پر شور انداز میں بہاؤ اور شادی والے گھر کی شہنائیوں کی آواز مل جُل کر فضا پر چھائے سناٹے کو زبان دے رہی تھیں یہ سالانہ یک فصلی علاقہ۔ بازو بھر لے گندم کے پودے ابھی کچے تھے۔

حد نظر تک پھیلے ہوئے اس ماحول کو دل آویزی اور رعنائی بخشنے والے عناصر اپنی تھوڑی بہت انفرادیت کے ساتھ وہی پرانے ہی تھے۔ بس اضافہ صرف Throwny کا تھا۔

پتھروں کے درمیان، کھالوں اور کھیتوں کی منڈیوں اور چٹیل جگہوں پر ایک تسلسل اور کثرت کے ساتھ اگی ہوئی ننھی منی جھاڑیاں جنکے سروں پر لہراتے لٹکتے منکتے سفید گلابی کاسنی سرخ نیلے پیلے چھوٹے چھوٹے سے پھول اپنے کانٹوں سمیت ایک ایسی منفرد چیز تھے جو قلب و نظر کو فوراً متاثر کرتے تھے۔ انکی اس خوبصورت سی دنیا کو میں نے بہت دیر اور شوق و جذبے سے دیکھا۔ اگر یہ جنگلی پھول تھے تو شہری پھول انکی خاک پا بھی نہ تھے۔ اندالو سبزی کا کھیت بھی نظروں کو بھاتا تھا۔

چترالی گھر غربت اور امارت کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اپنی ساخت میں ایک

جیسے تھے۔ کھاتے پیتے گھروں میں سونے کی جگہ گدے نظر آئے تھے ہاں البتہ ماٹھے گھروں میں پرالی کی دبیز تہیں ہی استراحت کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ ہر دو گھروں کے آنگن پھلدار درختوں سے لدے پھندے اور پچھواڑے موکی بزیوں سے مالا مال تھے۔

خوشی اور غم کا امتزاج بھی نظر آیا تھا۔ شادی والا گھر جس کے لانوں میں بھتی شہنائی کی فضا میں بھری تانیں اور بیمار عورت کی درد سے تڑپتے ہوئے ہونٹوں سے نکلی کراہیں۔ دونوں خاندانوں میں قرہی قرابت داری کے ساتھ ہمسائیگی بھی تھی۔ گھر کا سربراہ اگر اس وقت شادی کے بنگاموں سے حظ اٹھا رہا تھا تو بڑا بیٹا غفران ماں کو بازوؤں میں سنبھالے اسکی اشک شوئی میں جتا ہوا تھا۔ مستوح اسپتال میں ایکس رے مشین نہیں تھی بیماری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہم لوگ کتنے بد قسمت ہیں کتنے ارزاں ہیں۔ ہمارے لئے کہیں کچھ نہیں ہے۔

ہماری ننھی منی گائیڈ اینسہ تھی۔ بے حد خوبصورت اور دلآویز قسم کی بچی جسکے لہجے میں زمانے بھر کا اعتماد بولتا تھا۔ بڑوں کی طرح چیزوں کی تشریح کرتی تھی۔

پھر جیسے میری ساری توجہ اس آواز کی طرف منتقل ہوئی جو بڑے دھیمے انداز میں مجھ سے مخاطب تھی۔ ”شندھور کے لئے گاڑی کا بندوبست ہو گیا ہے بڑے لان کی مغربی سمت ڈرائیور منتظر ہے۔“ میں نے ڈرائیور اور جیپ کا تنقیدی جائزہ اس قصائی کی طرح ہی کیا تھا جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بکرے کی کلیات بمعہ جزئیات اسے ناپتا تو لتا ہے۔ ”صورت اگرچہ اچھی نہیں پر سیرت بے مثال ہے۔“ بات بہت عمدگی سے کہی گئی تھی۔ دھیان سے دیکھا تو احساس ہوا کہ چہرے پر علم کی چھاپ ہے۔ تھوڑی سی جھرجھری لی تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ چلو پڑھے لکھے آدمی کا ساتھ ہو رہا ہے اچھا ہے گا۔

اب صاحب خانہ کا کہنا کہ بھلا آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جاسکتی ہیں؟ کھانا تو ابھی دم پخت ہونا تھا اور میں رکاب میں پاؤں رکھ کر ایڑ لگانے کے لئے مری جا رہی تھی۔ معذرت کی پر اصرار غالب آیا جو کچھ سامنے آیا اسکی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ گوشت ابھی کچا اور چاول کھڑے تھے پر

کمال کا ذائقہ دار تھا ہاتھ کھینچنا مشکل ہو گیا تھا۔

ہر چین سے آگے بورتھ بروک بلیم کی وادیاں آئیں یہ پستی سے بلندی کا سفر تھا۔ جیپ کہیں پہاڑ کے دامن کہیں سینے اور کہیں گردن سے گزرتے ہوئے حسن و خوبصورتی کا ایک جہاں آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی۔ نظر پلٹی تو پچھلے پہاڑ پستہ قامت نظر آتے انکے سینوں پر ریگتی سڑک یوں لگتی جیسے کسی دیوہیکل جانور کو مونے رے کی ٹیکل ڈال کر اُسکے وجود کے آخری حصے تک کو مقید کر دیا گیا ہے۔ نیچے مختلف زاویوں اور ٹکڑیوں میں جھانکتی وادی کی کیفیت اُس چلبلی معشوقہ کی مانند تھی جو اپنے عاشق کی قید میں رہ کر بھی اپنے چاہنے والوں کو کبھی چلمن کی اوٹ سے کبھی کھلے عام اپنی اداؤں اور نخروں سے گھائل کرنے سے باز نہ آتی ہو۔ شیر ماگھ میں اگر گاڑی کا ٹائر پٹکچر نہ ہوتا اور رکنا نہ پڑتا تو یقیناً وادی کا وہ اینگل کبھی سامنے نہ آتا جس نے سچی بات ہے تڑپا کر رکھ دیا تھا کونے سے بند نیچے اترتی اور اوپر چڑھتی اس وادی نے کس طرح نظروں کو گھائل کیا یہ بتانا مشکل ہے۔

بلیم وادی کے کھلے کھلے مناظر سولا سپور کے خطرناک موڑ شندھور نالے کا پانی زرغون کی طرح شفاف کہ بے اختیار پینے کو جی چاہا۔ لاسپور کے شندھور ہوٹل سے گلاس مانگا۔ جانے کیسے پری وا سے لوگ تھے کہ ٹونا پھوٹا گلاس بھی پاس نہ تھا۔

خوبصورت جنگلی پھولوں کی کثرت نے رہت ملوک تے ذات ملوک والی مثال کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ فطرت کے سخت ہاتھوں کی ساری بدسلوکیوں کے باوجود یہ ننھی منی دنیا اپنی دلآویزی میں یقیناً انہیں مات دے رہی تھی جنہیں انسانی ہاتھ جانے کتنی دقتوں، کتنی حفاظتوں اور کتنے اہتمام کے ساتھ پروان چڑھاتے ہیں۔

پھر وہ لوگ میری بصارت میں آئے جو ریوڑوں کی صورت نیچے گھاٹیوں میں رواں دواں تھے جنہیں میں نے علی الصبح دیکھا تھا جنکے کندھوں پر دھری پوٹلیوں میں ان کا کھانا تھا۔ تو یہ اب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ میری چشم تصور نے دیکھا تھا کہیں راستے میں درختوں کی چھاؤں تلے

آبشاروں کے پاس وہ زکے ہو نکلے انہوں نے اپنے انگوچھوں سے کھانا کھولا ہوگا جہلیں کرتے کھایا ہوگا۔ ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر دم بھر کو ستانے کے بعد چل پڑے ہونگے۔ پتہ نہیں انہیں بھی ہماری طرح فکر و غم دنیا جو نکوں کی طرح چمٹی ان کا خون چوستی ہوگی یا نہیں۔

اب چند فٹ کی پتھروں سے انی پڑی روڈ ختم ہو گئی تھی اور گاڑی ایک ایسے سرسبز میدان میں داخل ہوئی تھی جسکے درمیان راستہ تھا۔ دائیں بائیں سرسبز میدانوں میں خوش گاہیں چر رہی تھیں۔ دفعتاً چلتے چلتے گاڑی تیز رفتاری سے ایک اور سرسبز میدان میں داخل ہوئی۔

میرے خدایا مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے جنت کا پٹ کھول کر مجھے اس میں داخل کر دیا ہو۔ میرے دائیں بائیں کے پہاڑ اور فرش سب ہلکے سرسبز غلاف سے ڈھنپے ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو لپٹے و مسل کی لذتوں سے حظ اٹھا رہے تھے جیسے چاہنے والے اٹھاتے ہیں۔

نیناؤں سبزی ماہل پانی سے لبالب بھری ہلکورے کھاتی جھیل کسی حسین مورت کی خوبصورت بلوری آنکھ میں نکلے آنسو کے کسی موٹے قطرے کی مانند نظر آئی تھی۔

تقریباً سو میل کے محیط میں پھیلی جھیل کے آخری سرے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے جیب رُوکوالی اور نیچے اتر آئی۔

میرے سانس میں ہیجان پیدا ہوا۔ نظروں میں حسرت کا سحر جاگا۔ اسوقت ہواؤں میں مستی تھی دھوپ میں سُستی تھی۔ نیلے آسمان پر بکھرے بادلوں کے ٹکڑوں میں آوارگی تھی۔ سبز پہاڑوں کے عقب میں بلند و بالا نوکیلی چوٹیوں پر برف کے گلیشیروں اور تالوں میں اُمنڈتی لُوہکتی برف میں رعنائی تھی۔

مہر النساء کیسرہ میرے ہاتھوں میں تھما کر اٹھلائی۔ ”اللہ جلدی سے جھیل کے پاس میری تصویر بنا دو۔“

میرے ہاتھوں نے کیسرہ تھامنے سے انکار کیا اور زبان نے کہا۔

”صبر کرو مہر النساء مجھے اپنی آنکھوں کو خسن فطرت سے سیراب تو ہونے دو“

پھر جیب چلتی رہی۔ جھیل ساتھ ساتھ چلتی رہی بائیں طرف کے پہاڑ کہیں کہیں رنگ بدلتے رہے۔ سامنے والے پہاڑ حسن و جمال کا پیکر بنے عاجزی سے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے آگے بڑھتے رہے۔

پھر جھیل پیچھے رہ گئی۔ گھاس کے کھلے قطعے آنے لگے گہری سبز گھاس سے سجے پولو گراؤنڈ اور سامنے سبز اور آف وائٹ جھلکیاں مارتا وی۔ آئی۔ پی گیٹ ہاؤس گزر گئے۔ بائیں ہاتھ خاصی دور جا کر فاصلے پر ٹینٹ نظر آئے تھے۔ جنرل لکڑی کے کونڈے اور ٹال سے گزر کر ہم گاڑی سے اتر کر مٹی سے بنے ہوئے اس چبوترے پر چڑھے جس پر مٹی اور لکڑی کی کوئی چھ کے قریب کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں ان کوٹھڑیوں کے سامنے اسی چبوترے پر کرسیوں پر سات آٹھ چترال سکاؤٹس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ جنہوں نے کھڑے ہو کر ”خوش آمدید“ کہا اس خوش آمدید میں محبت بھرا خلوص اور چاہت کا رچاؤ تھا۔

کرسی پر بیٹھے ہی فضا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جیسے میری زبان پھسل پڑی ”سبحان اللہ جنت میں رہتے ہیں آپ لوگ۔“

بڑی استہزائیہ ہنسی ان سب کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ پھر نائب صوبیدار شیر گل میری طرف متوجہ ہوئے۔ ”آپ چند دن یہاں رہیں پھر اس جنت کی حقیقت آپ سے پوچھیں گے۔“

”اب پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا ہونا تو ضروری ہے خوش ولی خان نے چائے کے برتن چھوٹی سی میز پر سجاتے ہوئے کہا۔“

”اگر جنت ایسی ہوگی تو میں پروردگار سے معذرت کرتے ہوئے ضرور کہوں گا۔ مولا تیری زمینی جنت کے زخم خوردہ ہیں اب اس آسمانی آفت سے بچا“

میں نے چائے کا کپ اٹھایا اور فضا کے سحر کو دیکھا اور شیر نادر کی اس بات کو سنا جو وہ اس لمحے کی منظر کشی کر رہا تھا جب مرغابیوں اور چکوروں کی قطاریں اس جھیل کے کناروں پر اترتی

نالے میں نہیں گرتا۔ میلوں میں پھیلی اس جھیل کا توازن کیسے برقرار رہتا ہے۔ پھر جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ کیسی بخیل ہے یہ فطرت کی گود سے مالا مال ہونے کے باوجود دھرتی کے کسی کھیت کھلیان کی کوئی بالی اسکے پانیوں کی شرمندہ احسان نہیں۔

وی۔ آئی۔ پی گیٹ ہاؤس اس منظر میں انگوٹھی میں چمکتے سبز جگنیے کی مانند پھب دیتا

تھا۔

پھر پولو گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے چترال سکاؤٹس سے پولو کی دلچسپ

تفصیلات جانیں۔

اس کہاوت کی صداقت کے بارے میں پوچھا کہ جسکے مطابق دائیں گول پوسٹ میں

پیشاب کرنے سے مخالف ٹیم ہار جاتی ہے۔

چترال سکاؤٹس کے بیشتر سپاہی کھلکھلا کر ہنس پڑے دو نے کہا ایسے ہی فضول

ڈھکوسلے گھڑے ہوئے ہیں۔ چند ایک نے کہا۔ ہوتا ہے ایسا۔

سٹیڈیم کی گھاس اتنی گھنی سبز اور اسقدر سلیقے سے کٹی ہوئی تھی کہ تاحد نظر لگتا تھا جیسے سبز

قالین بچھادیئے گئے ہوں۔

پولو کے کھیل میں ہماری جان ہے۔ یہ بڑا دلورہ انگیز خون کو گرمانے والا مہارت ذہانت

قوت اور انصاف پسندی کا کھیل ہے۔ شندھور کا پولو گراؤنڈ خود ساختہ نہیں قدرتی ہے۔ شندھور

دفاعی اور جغرافیائی اعتبار سے اہم درہ ہے۔ برف پوش پہاڑوں میں تقریباً آٹھ میل کے رقبے میں

پھیلی یہ ایک ایسی سطح مرتفع ہے جس میں سوامیل لمبی یہ خوبصورت جھیل دلفریبی میں اپنی مثال آپ

ہے۔

سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے چترال سکاؤٹس کے ساتھ تصاویر بنائیں۔

پھر میں اس راستے پر آ کر کھڑی ہوئی جو گلگت کی طرف جاتا تھا۔ قراقرم ہمالیہ اور

ہندوکش کے پہاڑی سلسلے ان سلسلوں میں ایک سے دوسری جگہ جانے کے یہ دشوار گزار راستے۔

پروردگار تیرا انسان بھی کیا چیز ہے۔ قرونوں سے صدیوں سے تیری چیرہ دستیوں کا کس پامردی سے مقابلہ کر رہا ہے۔ کہیں تیشہ کہیں چپو کہیں اوزار ہاتھ میں تھاے زندگی کو دریافت اور ایجاد کے نئے نئے انداز دے رہا ہے۔ ان برفانی چوٹیوں ان دشوار گزار دروں میں زمانوں پہلے بھی زندگی تھی اور آج بھی ہے۔ ان پر ہیبت پہاڑوں کے سینوں کے جگر چھلنی کر کے اسنے میڑھے میڑھے راستے بنائے۔ کبھی عقل دنگ رہتی ہے کبھی ذہن ماؤف ہوتا ہے کیوں اور کیسے جان نہیں چھوڑتے۔

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے اس سارے منظر پر نگاہ ڈالی۔ جھیل کو دیکھا اور کہا۔  
 ”تیرا دیدار میں نے سناٹے اور تنہائی میں کیا۔ زندگی نے اگر مہلت اور صحت دی تو تجھے بنگاموں کی گود میں مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہوں گی۔ تیرے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا نظارہ کروں گی۔ انشاء اللہ۔“  
 الوداع میری شندھور جھیل۔

## پیراڈائز لاج۔ قلعہ مستوج لُوک اور بلوک۔ بونی کا ایک گھر

یہ اونچائی سے اترائی کا سفر تھا۔ راستے کی ناہمواری کچی سڑک کی تنگی اور خطرناک اندھے موڑ اب زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آرہے تھے۔ پر میں ان سبھوں سے بے نیاز صرف یہ سوچنے میں جتی ہوئی تھی کہ ہمیں رات کہاں گزارنی ہوگی۔ ڈرائیور مبارک شاہ نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں مختصراً کہا تھا۔ کہ وہ ہمیں ہرچھین میں دوسرے ڈرائیور کے حوالے کرے گا۔ مغرب تک وہ آپکو مستوج لے جاسکتا ہے اگر اسکی گاڑی راستے میں کہیں خراب نہ ہوئی تو۔

ہرچھین میں جہاں رک کر اترنے کے لئے کہا گیا۔ اسکے دائیں طرف چند گھر اور دو تین دوکانیں، بائیں طرف ایک شکستہ بلڈنگ اور درمیان میں پانی کی کھال بہتی تھی۔ کھال کے کنارے چند مرد بیٹھے لومڑی کی کھالیں اور انکے سروں کی صفائی ستھرائی میں منہمک تھے۔

”چلیے سامنے میرا گھر ہے۔ آپ چائے پیئیں تھوڑا سا ستائیں۔ اس دوران میں

مستوج کے لئے گاڑی کا بندوبست کر لوں۔“

یہ ایک چھوٹا سا غریبانہ گھر تھا۔ آنگن میں آلوؤں کے پودوں کے پاس ایک

خوبصورت سی بچی سرکوباتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔ ”بیمار ہے یہ“ مبارک نے کہتے ہوئے بیٹھک کا

دروازہ کھول دیا۔ نئی نئی تعمیر شدہ بیٹھک چھت پر سجے نئے نکور بالے اور تختے کھڑکی اور دروازوں

کی دیار کی لکڑی کی مخصوص ہمک فرش پر بچھے نمندے کی باس اور بند کمرے میں پھیلی سیلن کی بو سہوں نے مل جل کر نتھنوں پر اس منہ زور عورت کی طرح چڑھائی کی جو خاوند کے دلہیز پر پاؤں دھرنے کے ساتھ ہی تبروں سے اس کی تواضع کرتی ہے۔ مبارک شاہ نے فی الفور کھڑکی کھول دی باہر کی تازہ ہوا کی اندر کی بیمار فضا سے گتھم گتھا شروع ہوئی۔ زور آور نے کمزور کے وجود کے کچھ ٹوٹوں کو باہر پھینکا۔ ذرا سا سکون ملا تو میں نے ناگلوں کو نمندے پر پھیلاتے ہوئے نیم دراز ہو کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پر کھڑکی سے آتی شام کی کرنوں کا دھیماپن مجھے مضطرب کر گیا۔ مستوج تک خاصا لمبا سفر ہے۔ کہیں راستے میں ہی نہ لڑھکتے پھریں۔

باہر جھانکا۔ مبارک تو کہیں نظر نہ آیا۔

آؤ مہر النساء ان کی راتھینی (چترالی کمرہ) دیکھتے ہیں۔

دو کچے تاریک کمرے کے آگے راتھینی تھی۔ کمرے کے وسط میں چولہا جلتا تھا۔ تین حصوں میں تقسیم شدہ کمرے کے ایک طرف مبارک شاہ کا بوڑھا باپ پرالی کے بستر پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ من موئی سی نو عمر بیوی چولہے میں روٹی سینک رہی تھی۔ دیواریں اگر دھومیں سے توڑے کی طرح کالی تھی تو چھت سانولی۔ سامنے والے حصے میں دیوار میں گڑی چوٹی کہنہ سالہ الماری میں ایلومینیم اور سلور کے برتن چمک رہے تھے۔ اور جب وہ دلاری سی لڑکی روٹی پر لگی راکھ جھاڑ کر اُسے پلیٹ میں رکھ رہی تھی مبارک شاہ نے اندر آ کر کہا۔ ”گاڑی آگئی ہے“

گرم روٹی اور گھر کا جماد ہی اور قبوہ۔ وہ جو کسی نے کہا۔ سچ کہا تھا۔

”پگھ نہ دیکھے سالنا“۔

شوق و رغبت سے کھایا اور لطف اٹھایا۔

آنگن میں دونوں میاں بیوی کی تصویر بنائی اور گاڑی میں بیٹھے۔

مستوج میں کوئی ڈھنگ کا ہوٹل مل جائے مہر النساء، فکر مند تھی۔ ڈرائیور نے تسلی دی فکر

مت کریں۔ کچھ پہاڑوں کی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بہت منفرد نظر آتے ہیں۔ شہید اس کی

وادی کے آغاز میں ہی پہاڑیوں ظاہر ہوئے جیسے سیمنٹ کی ایک سیدھی دیوار بنا دی گئی ہو۔ مستوح وادی میں داخلی دبانے پر پہاڑ خاکستری کنکر یوں کے مانند تھے یوں جیسے کارنیٹو کے منہ پر چاکلیٹی دانے ہوں۔

مستوح میں داخلے کے ساتھ ہی بروغل پاس کا سنگ میل نظر آیا۔ اسوقت تھکاوٹ شدید تھی پر پھر بھی میری آنکھوں میں بروغل پاس دیکھتے ہی ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک تشنہ آرزو نے سینے میں شور مچایا۔

گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی گئی۔ مین سڑک سے وادی خاصی پیچھے ہے۔ اس وقت جھنپنا تھا جب مختلف گلیوں میں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک مکان کے سامنے رک گئی بہتی کھال کے کنارے پختہ پٹی کے پاس چند لڑکے کھڑے تھے۔ ”کوئی ہوٹل کوئی ریست ہاؤس“۔ میں نے اتر کر پوچھا۔ لڑکوں نے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ”پیراڈلیز لاج۔“

پردیس میں گھر جیسا مزہ۔ رہنا۔ کھانا پینا سبھی کچھ گھریلو ماحول میں۔ دام بھی مناسب۔

گلی کے کنارے واقع اس گھر پر میری طائرانہ سی نگاہ کچھ پسندیدگی لئے ہوئے نہ تھی۔

”ریست ہاؤس کدھر ہے؟“ میں نے لڑکوں سے دوبارہ پوچھا۔

”سامنے والی سڑک پر آگے تک چلتی جائیے نصف فرلانگ پر ریست ہاؤس کی عمارت

ہے۔ پر ایک بات اس کا کرایہ ساڑھے چار سو روپیہ ہے اور اجازت اے۔ سی سے لینی پڑے گی۔“

مہر النساء کا منہ لٹک گیا اب اس سے اے سی کے پاس کون بھاگتا پھرتا۔

چلو جو ہے اسے تو پہلے دیکھیں۔

پیراڈلیز لاج کچی بات ہے نام کو بڑا زبردست قسم کا بیٹہ تھا۔ پٹی سے چند قدم پر داہنے

ہاتھ گلی میں مڑ کر جس دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تھے جھٹپٹے کی اُداسی چھوٹا سا آنگن جسکے

ایک حصے میں کچے پیلے رنگ کے کھلے پھول تنہائی کو کچھ زیادہ ہی بڑھا رہے تھے۔ سامنے کمرے

کے کھلے دروازے فرش پر بچھے سستے قالینوں کے ساتھ ساتھ دیواروں کی سفیدی اور کارنس پر بچھے رنگین موروں کی کڑھائی والے میز پوش اس سناٹے میں تھوڑی سی جان ڈال رہے تھے۔ سامنے ہاتھ روم تھا جس کا ٹونا ہوا دروازہ پنڈ کا بھاؤ روڑیوں کے مصداق اندر کا احوال بتا رہا تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھی یہ جاننے کے لئے کہ وہ کیسا ہے جب لاج کے مالک نے نہ نہ کرتے ہوئے میرا راستہ روکا۔ ”ادھر مت جائیے۔“

”کیوں وہاں کوئی تو پچی بیٹھا ہے؟“

’یا اللہ‘ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ وہی صبح والا سن وٹہ کوچی ماچار پائی پر لینا چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف تھا۔

مہر النساء بھی میرے پیچھے ہی آگئی تھی۔ ”یہ کیا“ اُس نے کوچی ماکو دیکھتے ہوئے گھبرا کر کہا۔ ”یہاں تم نے مردوں کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ ادھر ہم اکیلی عورتیں۔“

”آپ کو کسی جوان عورتیں ہیں۔“

شانوں تک کٹے بالوں اور دیدہ زیب لباس پہننے والی مہر النساء کو بھی اس نے میرے ساتھ ملا دیا تھا۔

”ہم کیا تمہیں بوڑھی نظر آتی ہیں۔“

بے چارہ اکبر حیات اب کیا کہتا۔

مہر النساء کے تمللانے پر اسکی بے بسی قابل دید تھی۔ کاروباری مجبوریاں کسی دشوار گزار دریا کی طرح سچا جواب دینے کے راستے میں حائل تھیں۔ زیرک اور ہوشیار آدمی تھا۔ مسکینی سے بولا۔

”آپ کی دل آزاری تو میرا مقصد نہ تھا۔“ کبخت کس انداز میں چوٹ کر گیا تھا۔

بہر حال قالینوں پر دھلی ہوئی سفید چادریں بچھانے اور اپنی بیٹی کو ہمارے ساتھ سلانے پر بات ختم ہوگئی۔ جو کھانا ہم نے رات کو کھایا وہ سادہ ہونے کے ساتھ لذت کے اعتبار سے اُن کھانوں میں

سے ایک تھا جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جاسکتا ہے۔ پالک گوشت، ماش کی دال، سلاد اور لسی کے ساتھ گھر کی روٹی۔ تعریف پر اکبر حیات نے نتھنے پھلائے اور بولا۔

”میری بیوی کی انگلیوں سے ذائقہ کسی رس کی طرح ٹپکتا ہے۔ جو ایک بار اس کے ہاتھ کا کھانا کھالے وہ دوبارہ ہمیں آتا ہے۔“

اس میں یقیناً مبالغہ نہیں تھا۔ یہ جولائی کی خشک رات تھی جب روشن چہرے والی اکبر کی بیٹیاں اور بیوی ہمارے پاس آ کر بیٹھیں۔ قبوے کی سروں اکبر نے دی۔ میں نے چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اکبر کی بات کو کاٹ دیا جب اُس نے ”مستوج بہت خوبصورت وادی ہے“ کہتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اکبر وادی کی طرف آتے ہوئے خوفناک ویرانی اور اُجاڑ پنے کا احساس ملتا ہے۔ مین سڑک سے یہ اتنی دور ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اُسکے رُخسار پر زانے کا تھپڑ مار کر اس کا چہرہ پشت کی دیوار کے ساتھ چپکا دیا ہے۔“ اکبر کی ہائی اسکول میں پڑھنے والی بیٹیاں بہت ہنسیں۔

”مگر وادی ثقافتی اعتبار سے بڑی امیر ہے۔ اسکے موسیقار۔ اسکے کہانی گو اسکے لوک شاعر مرد خواتین سمجھوں نے تاریخ چترال میں اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔ اسکی خواتین کتنی جیالی کتنی اوالعزم اور کس قدر حوصلہ مند تھیں کہ سن کر آ پکو حیرت ہوگی۔“

اور واقعی وہ سچی کہانی حیران کرنے والی تھی۔ مستوج کے گاؤں ”چنار“ کے ایک میاں بیوی کی دو بیٹیوں کے نام لُوک اور بلُوک تھے۔ نو سال کی لُوک کی شادی اسکے والد کے دوست کے بیٹے سے ہونا طے پائی۔ بیاہ کا دن آ پہنچا۔

گاؤں بھرنے نیو تہ ڈالا۔ شام کو بارات کا استقبال دلہیز (چترالی برآمدہ) میں ہوا۔ بائی پٹنس (نشست گاہ) میں بٹھایا گیا۔ کردے میں نیم گرم پانی سے ہاتھ دھلانے کے بعد لکڑی کے بنے ہوئے ڈونگوں میں اشپری پیش کی گئی۔ گونجا (چترالی سنور) میں لُوک کی سہیلیاں اُسے دم کیا

ہوا جوڑا پہنا کر سجا بنا رہی تھیں۔ جب رات گئے بارات حویلی جا کر سو گئی۔ لُوک کی سہیلیاں اور کاؤں والے بھی اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لُوک بھی سو گئی۔ ماں بقیہ کام پنپانے لگی کہ صبح سویرے بارات کو رخصت ہونا تھا۔ رات کے آخری پہر ماں نے جب لُوک کو جگانا چاہا، اسکی نبض خاموش تھی۔ سانسیں ساکت تھیں اور جسم بے جان تھا۔ ماں نے چیخ ماری چاہی پر رُک گئی۔ باپ کو بلا کر اپنی پر اسے ضبط کی تلقین کرتے ہوئے بڑی جی داری سے صورت حال سے پنپنے کا تہیہ کرتے ہوئے سات سالہ بلُوک کو دلہن بنانے کا فیصلہ کیا۔ صُبح کاذب سے صُبح صادق ہوئی۔ اُسے پرندوں کی چبکارسنی۔ فضا کے خُسن کو ایک نظر دیکھا۔ دل میں اُٹھتے درد کے طوفان کو جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہنا چاہتا تھا ضبط کے بند لگاتے ہوئے روکا۔ ناشتے میں مصروف ہوئی۔ بارات رخصت ہوئی وہ گھر کی چھت پر جا کر اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی۔ اسکے کانوں میں بلُوک کی آوازیں گونجتی رہیں۔ میری بہن لُوک کہاں ہے۔ میری پیاری ماں مجھے نیند آ رہی ہے۔ جب بلُوک اور بارات نظروں سے اوجھل ہوئی۔ وہ نیچے اُتری۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ان اشعار کے ساتھ تجہیزہ تلفین کی۔

میری بیٹی ماں تجھ پر واری  
 اے لوگو تم میری ننھی مُنی دلہن کے بال سنوارو  
 ماں کے دل میں تیرے مستقبل کے دیپ جلتے ہیں  
 اپنے گھر کی ہو رہنا۔ تیرے پیا کا گھر تیرا ہے  
 جہاں کہ تجھ کو رہنا ہے

بہت سویرے جاگی۔ بیرونی دروازوں کی کنڈیاں کھولنے میں ذرا دشواری نہ ہوئی پر ان کے آگے رکھے وزنی پتھروں کو ہٹانے میں مشقت کا سامنا ہوا۔ انہیں ہٹاتے ہوئے بے اختیار میں نے سوچا۔ کہ دروازوں کے آگے یہ بھاری بھر کم پتھر کیا شرارتی سیاحوں کے چپکے سے بھاگ بھگنے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے سلسلے ہیں۔ پر جہاں ذرائع آمد و رفت اتنے دشوار ہوں

وہاں کوئی ڈنڈی کیسے مارے گا۔

بہنی سے ڈھلانی راستے پر میں بھاگتی گئی۔ اس خیال سے بے نیاز کہ راستہ کونسا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ ریٹ ہاؤس کی عمارت نظر آئی۔ رُک کر اُسے دیکھا۔ چلو اچھا ہوا میں نے اپنے دل میں کہا۔ نجلِ خواری سے بیچے۔

آگے چھوٹی سی ایک مسجد تھی۔ نہ کوئی بندہ نہ بندے کی چھوٹی موٹی ذات۔ ہو کا عالم۔ نماز پڑھتے ہوئے خوفِ ساطاری رہا۔

واپسی پر میں نے انکے رہائشی حصے کو دیکھنے کا سوچا۔

تنگ سی راہداری سے ہوتے ہوئے جو حصہ سب سے پہلے نظر میں آیا اسکی کرسی زمین سے اتنی اونچی تھی کہ آنگن میں پر پھیلائے شہتوت کے درخت کی پھلدار ٹہنیاں چہوترے پر جھکی پڑتی تھیں۔ ریلے خوش ذائقہ زبان پر رکھے پل بھر میں کھل جانے والے شہد آگیں شہتوتوں کو توڑنے کے لئے کسی زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ ذرا سی ہاتھ کو تکلیف دینے والی بات تھی۔

سامان سے اٹے پڑے کمرے میں اکبر حیات ریڈیو پر بی بی سی سن رہا تھا۔ رسوئی گھر میں اکبر حیات کی حسین بیوی پراٹھے بنا رہی تھی اور میرے لئے یہ کس قدر تعجب کی بات تھی کہ وہ سن و نہ جا پانی اسکے پاس اکڑوں بیٹھا چائے پراٹھا کھا رہا تھا۔

رات کے کھانے کی طرح صبح کے ناشتے کا بھی جواب نہ تھا۔ ایسے خستہ اور لذیذ پراٹھے کہ بندہ کھاتا جائے اور دل نہ بھرے۔

میرے اس سوال پر کہ مستوج میں کون کون سی چیزیں دیکھنے والی ہیں اکبر حیات فوراً بولا۔ ”پہلے تو قلعہ دیکھئے۔ دریائے یارخون اور مستوج کا سنگم قابل دید ہے۔“

بزوغل پاس۔ میں نے بات کاٹی واخان کی پٹی اور تاجکستان کی سرحد۔

بہت دشوار گزار راستہ ہے اور میں آہ بھر کر رہ گئی۔

مستوج کے بازار کا طول و عرض بس اتنا تھا کہ نقطہ آغاز ہی نقطہ اختتام تھا۔ اشیائے

ضروریات زندگی سے بھری ہوئی چند دوکانیں اور بس۔

قلعہ مستوج کے بارے میں پوچھنے پر سننے میں آیا۔

”بس چند قدم پر ہے۔“

”چلو پیدل مارچ کرتے ہیں۔ واک ہی ہو جائے گی۔“

مہر النساء بھنائی۔ ”انکے چند قدم میں جانتی ہوں۔ تڑکے سے واک میں جتی ہوئی

ہو۔ ابھی بھی کسر باقی ہے۔ سیدھی طرح کسی سواری کا بندوبست کرو۔“

ہمارا اگلا پڑاؤ بونی تھا۔ بونی کے لئے گاڑی کے بارے میں جاننے کے لئے میں نے

ایک دوکاندار سے پوچھا۔ میرے ہونٹ یقیناً لٹک گئے تھے کیونکہ جلیبیاں تلتے تلتے اُس نے خاصی

بے اعتنائی سے کہا تھا۔

بک کرنی پڑے گی۔

چلونی الحال بونی کو چھوڑو سردست تو قلعہ دیکھنے چلنا ہے۔ اسکا سامان کرو۔ میں نے

اپنے آپ سے کہتے ہوئے کسی سوزوکی والے سے بات کرنے کا سوچا۔ واقعی پیدل قلعے تک جانا

اپنے آپ کا ملیدہ کرنے والی بات تھی۔ بے شمار میزھی میزھی گلیوں اندھے اور روشن موڑوں کے

بعد کہیں قلعے کی صورت نصیب ہوئی۔ پر اس سے پہلے جس نظارے نے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل

کے غبارے کو شادمانی کی ہوا سے پھلا دیا وہ پی۔ نی۔ ڈی۔ سی کا وہ شاندار موٹل تھا جو ابھی تکمیل کے

آخری مراحل میں ہونے کے باوجود بڑی شان و شوکت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پر شکستہ پا قلعے کو دیکھ کر

دل کے غبارے کی ہوا یوں نکلی کہ وہ پچک کر رہ گیا۔ کیا یہ کہوں کہ یہ پہلوئے حور میں لنگور والی بات

تھی۔ یا اس احساس کا ماتم کروں جسکے تحت یہ عظیم ورثہ ٹوٹ پھوٹ سے دو چار ہو کر کھنڈرات میں

تبدیل ہو رہا ہے۔

قلعے کے مرکزی دروازے پر جس ملازم سے ملاقات ہوئی اُس نے کچھ کہے بغیر گائیڈ

کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ ادھیڑ عمر کے اس مرد میں پیشہ ور گائیڈ بچنے کی صلاحیت بدرجہ اتم

موجود تھی۔ میری طرح اُسے بھی مستوح کے راجہ کرنل خوش وقت کے بڑے بیٹے سے گلہ تھا کہ اُس نے قلعے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے اس پر پیسہ لگانے کی بجائے کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چترال میں سیاحوں کے لئے عالیشان ہندوکش ہائینس بنائی۔ کیا تھا اگر وہ اپنے آباؤ اجداد کی اس نشانی کو زمانے کے ہاتھوں خورد برد ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ اس پر بھی خرچ کر دیتا۔

اس روشن اور خوبصورت صبح جب میں ٹوٹی پھوٹی بالکونیوں، غلام گردشوں، زنان خانوں، دیوان خاص اور عام جیسے طرز تعمیر والے شاندار تاریخی ورثہ کو لیر لیر ہوئے دیکھ کر خود دگر رفتہ سی تھی مجھے اس کا کرب اور دکھ سمجھ آتا تھا کہ اُنکی زندگیاں انہی چھتوں اور دیواروں کے سایوں تلے کچھ بسر ہو گئی تھیں اور کچھ ہو رہی تھیں۔ پھر وہ ہمیں ایک ایسے حصے میں لایا کہ جس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار یوں محسوس ہوا جیسے صحرا میں چلتے چلتے یکدم کسی نخلستان میں داخل ہو گئے ہوں۔ ایک وسیع و عریض دبیز گھاس کا میدان نظروں کے سامنے پھیلا ایک خوشگوار سے احساس سے مالا مال کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ چند جدید وضع کے کمرے تھے۔ برآمدے میں ایک دلکش خاتون ہماری پذیرائی کے لئے آئے بڑھی۔

راجہ کرنل خوش وقت کی صاحبزادی سلطانہ بی۔ اے، بی۔ ایڈ اپنے بچوں اور داماد کے ساتھ کراچی سے یہاں چند یوم گزارنے آئی تھیں۔ ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ بدلتی اقدار اور بدلتے حالات۔ ماضی کا وہ وقت جب وہ بہنیں ہوشل سے چھٹیاں گزارنے یہاں آتیں۔ راستے میں رعایا کی چاہتوں اور جانثار یوں کے بے شمار واقعات اور اب نئی نسلیں انہیں پرکاہ برابر اہمیت دینے سے انکاری۔ عروج و زوال کے یہ ایسے۔

بونئی کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو احساس ہوا کہ صبح کی نرم نوخیزی دھوپ شباب میں داخلے کے لئے تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ہماری خواہش پر ڈرائیور ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں سے ہم نے دریائے یارخون اور لاسپور کا ملاپ ہوتے دیکھا۔ دریائے لاسپور گول بشار

سے نکلتا ہے جبکہ دریائے یارخون پاک افغان تاجک سکلیا نگ سے۔  
 ہوائیں ٹھنڈی تھیں اور دونوں دریاؤں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ سناٹے کی اس زبان  
 سے باتیں کرتے کرتے ہم پھر گاڑی میں بیٹھے۔

یکدم ننگے پنجھے پہاڑوں کی اوٹ سے ایک دوسرے کے مد مقابل واقع جوادیاں ابھر  
 کر سامنے آئی تھیں یہ پرواک اور سنو غر تھیں۔ یہ وادیاں نہیں آرٹ کے بکھرے ہوئے شاہکار  
 تھے جنہوں نے آنکھوں کو پھٹاؤ کی حد تک پھیلا کر جھپکا نا بھلا دیا تھا۔

ٹوٹی پھوٹی کچی سڑک راستے کی خوفناک عمودی اترائی چڑھائی، انجر پنجر ہلاتی گاڑی  
 اور آگ برساتا سورج سب تلخ احساسات وقتی طور پر غائب ہو گئے تھے۔ کاش یہ سڑک مٹختہ  
 ہوتی۔ کاش یہاں اچھی گاڑیاں دستیاب ہوتیں کاش ہم اب تک ان وادیوں کے حسن کو کیش  
 کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر چکے ہوتے۔ کتنے ہی سارے 'کاش' تھے جو میرے لبوں پر  
 چل چل کر مجھے مضطرب اور بے کل کر رہے تھے۔ گاڑی رُک گئی تھی۔ کسی خرابی نے اُسے گھیر لیا  
 تھا۔ خدا کا شکر کہ ویرانہ نہیں تھا۔ ڈرائیور گاڑی کی جانچ پڑتال میں لگ گیا۔ ذرا فاصلے پر چیک  
 پوسٹ تھی اور سامنے سیبوں کے درختوں تلے چند لڑکے باتوں میں مگن تھے۔ میں اور مہر النساء اتر  
 کر ان کے پاس چلے گئے۔ سیبوں کے بھرے پُڑے درختوں پر نظریں ڈالتے ہوئے میں نے  
 لڑکوں سے کہا۔

”راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال والی مثال تو بہت سنی تھی پر اُس کا مفہوم اب سمجھ میں آیا

۔ ہمارا تو وہ حال ہے کہ دریا کے کنارے آ کر بھی پیا سے ہیں۔“

متانت سے ایک لڑکے نے جواب دیا ”دراصل خوبانی اور توت دونوں ختم ہو رہے  
 ہیں۔ گھروں میں ابھی بھی لگے نظر آتے ہیں آپکو ضرور کھلاتے پر گھر یہاں سے دور ہیں۔“ دفعتاً  
 جیسے مجھے محسوس ہوا کہ میری بات کا جواب دینے والے لڑکے کی آنکھیں نم نم سی ہیں۔ میں نے  
 سب لڑکوں کو بغور دیکھا وہ تعداد میں کوئی چھ تھے اور پُچپ چاپ سے بیٹھے جانے کن سوچوں میں گم

تھے۔

”کچھ ہے۔“ جیسے میری چھٹی حس نے کہا۔

”کیا بات ہے بیٹے؟“

میرے استفسار پر لڑکوں کے سر جھک گئے تھے۔ معاملے کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے میں ان کے پاس بیٹھ گئی اور سوال دوبارہ دہرایا۔

”خالہ ہمارا بہت پیارا دوست ہمارا بھائی ہمارا بچپن کا ساتھی کارگل میں داد شجاعت دیتا شہید ہو گیا ہے۔ پرسوں اس کی میت یہاں پہنچی تھی۔“

”شہباز خوش نصیب تھا اسے شہادت نصیب ہوئی۔ میں تو جاتے جاتے رہ گیا اور وہ چلا بھی گیا۔“ شہباز کی خوش نصیبی پر رشک کرنے والا دوسرا لڑکا جو میرے سامنے تھا بمشکل بائیس تیس سال کا ہوگا۔ شباب کے اس دور میں شہادت کو خوش نصیبی سمجھنے والا اپنی تربیت اور انداز فکر کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ میری آنکھوں نے یقیناً حیرت کے تاثرات اُگلے ہوں گے تبھی تو ایک لڑکے نے جو بالکل خاموش بیٹھا تھا کہا۔ ”چترال کے بہت سے نوجوان معرکہ کارگل کے جہاد میں مصروف ہیں۔ پندرہ بیس دن بعد جب ہمیں کسی کی شہادت کی خبر ملتی ہے تو سرخ محرابوں جھنڈیوں اور بینروں کے ساتھ اس کا استقبال ہوتا ہے۔“

”یہ سلسلہ کب سے شروع ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جب سے برف پگھلنے کا آغاز ہوا۔“

میرے اللہ نیچے کے لوگ تو کرکٹ ورلڈ کپ کے بخار میں بھنک رہے تھے۔ خود میرا اس بار چترال آنا شندھور میلے کے سلسلے میں تھا۔ اسکے التوا کی خبر نے کیسے بے گل کیا تھا یہ تو اب جانی تھی کہ ایسے میں شندھو میلہ سجانا چترالیوں کے لئے کتنا مشکل تھا۔

”بیٹے اس کی ماں کا کیا حال ہے؟“

”وہ مائیں جن کے بچے جہاد کے لئے جاتے ہیں سچی اور سچی مسلمان عورتیں ہیں خالہ

آپ یقین کریں گی شہباز کی ماں نے ایک آنسو نہیں بہایا۔ جب انہیں بیٹے کا چہرہ دکھایا تو انہوں نے سبحان اللہ کہا۔ شہباز کی میت پندرہ دن بعد ہمارے پاس پہنچی تھی اور وہ اتنی تروتازہ تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی وہ سویا ہے۔“

اسی دوران ڈرائیور بھی گاڑی کی مرمت سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑتا ہمارے پاس آ گیا تھا۔

”ہمارا اسلام ہے اُس ماں کو“ ہمارے ڈرائیور نے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔  
اُس ماں نے اپنے دونوں ہاتھ اللہ کے حضور جوڑے تھے اور روندھی آواز میں بولی تھی۔

”میرے اللہ تو بادشاہ ہے میں نے شہباز کو کیسے پالا کیسے جوان کیا اور پھر کس حوصلے سے اُسے تیری راہ میں بھیجا۔ اُسکے مسلمان مظلوم بھائیوں کو اس کی ضرورت تھی۔ میرے اللہ میں سُرخرو ہوئی۔ تیری امانت میں نے تجھے لوٹائی میری قربانی قبول کرنا۔ پھر اس نے مجمع کو دیکھا اور کہا۔

شاہ عرب حشر کے دن میری شفاعت کرنا کہ میں نے تیرے دین کے لئے اپنا جگر کا ٹکڑا قربان کیا۔“

میری آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں کا نچلا حصہ دانتوں تلے تھا۔ جس منڈیر پر میں بیٹھی تھی وہاں سے لڑھک کر نیچے آگئی۔ میرے سارے جسم میں جیسے کرنٹ تھا۔ تڑپ کر میں نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ ”گاڑی کو شہباز کے گھر لے چلو اُس عظیم خاتون کے دیدار کے بغیر اب میں آئے نہیں جاسکتی۔“

ڈرائیور نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ کو اس کے گھر تک کافی پیدل چلنا پڑے گا آپ کے جذبات میں سمجھتا ہوں مگر بہت اونچائی نیچائی ہے۔“

”ارے بھئی میں ان راستوں پر چلنے کی عادی ہوں۔ گھبراؤ مت میرے جیسی دنیا دار

عورت کے لئے اُن ہاتھوں کو بوسہ دینا اُس چہرے کا دیدار کرنا اور اُس زبان سے نکلتے کلمات کو سننا بہت ضروری ہے کہ جس نے نماز کے بعد اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر ہمیشہ اپنے بچوں کے لئے دنیا کی بہتری ہی طلب کی۔ دین تو کبھی نظر نہیں آیا۔“

پھر اونچے نیچے میڑھے میڑھے ڈھلانی عمودی راستوں پر چلتے چلتے ہم وہاں پہنچ گئے جہاں گاڑی رُک گئی۔ خوبانی، شہتوت، سیب اور انگور کی بیلوں سے سجے اس گھر میں اسی ہستی نے استقبال کیا جسکے اندر کے ایمان کا نور اُسکے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ میرے اور مہر النساء کے ہاتھوں کا بوسہ لیتے ہوئے وہ ہمیں نشست گاہ میں لے آئیں۔ اونی رنگین نمندے پر بیٹھ کر باتیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا ڈرائیور ترجمانی کر رہا تھا۔ میرے سامنے وہ عورت تھی جس نے مکتب کی شکل نہیں دیکھی تھی جس نے کسی سکول میں نہیں پڑھا تھا جو ہمارے نزدیک جاہل تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہماری جان ہمارا مال ہماری اولاد سبھی اللہ کے لئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو جہاں دین پر دنیا تنگ ہو رہی ہو وہاں جہاد ضروری ہے۔ جانے سے پہلے میں نے بیٹے کا ماتھا چوما۔ اُس کا چہرہ چوما اسکے ہاتھ چومے اور کہا۔

جاؤ مجھے سر خرد کرنا۔

الحمد للہ اُن نے مجھے میرے رب کے حضور سر خرد کیا۔“

میرے گلے میں جیسے میرا سانس پتھر کا گولہ بن گیا تھا۔

بونی میں جب ڈرائیور نے ہمیں بیچ چوراہے اُتارنا چاہا تو میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔

”حد کرتے ہو میاں۔ ذرا باہر دھوپ کو تو دیکھو۔ پہر ڈھل گیا ہے پراسکا بانگین یوں لگتا

ہے جیسے ابھی ابھی انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا ہوں تم خود بتاؤ ایسے میں دو غریب الد یا رادھیز عمر عورتیں

کہاں سواری کے لئے دھکے کھاتی پھریں گی۔ سیدھے سبھاؤ ہمیں ارشاد بابا کے گھر لے چلو۔“

وہ کیوں اتنی لیت ولعت سے کام لے رہا تھا۔ اسکا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب گاڑی

نے اونچی نیچی بہت سی ڈھلانیں طے کیں۔ میڑھے میڑھے راستوں کے موڑ کاٹے برساتی نالے

میں سے گزری۔ ارشاد بابا کا گھر بلاشبہ اللہ میاں کے پچھواڑے میں تھا۔ کہ صرف ایک زقند بھرنے پر ان پہاڑوں کے گلے ملا جاسکتا تھا جنہوں نے وادی کو بند کر دیا تھا اور جو گھر کے ہمسائے میں خاموش پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔ گھر کے سامنے لمبا چوڑا چبوترہ تھا اس پر اخروٹ کا زمانوں پرانا درخت پر پھیلانے کھڑا تھا۔ چبوترے پر چار پائیاں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ چار پائیوں پر گاؤ تکتے سجے تھے۔ میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ ہوائیں ٹھنڈی تھیں۔ چھاؤں میٹھی تھی۔ ارشاد بابا کا بھائی ہمیں اندر لے جانے کے لئے بضد اور ہمارا اصرار باہر بیٹھنے پر۔ بہت خوبصورت نظارے تھے۔ آنکھوں کے ذرا سے جھکانے اور اٹھانے پر بڑے دلچسپ مناظر بصارت کی زد میں آ رہے تھے۔ خاصی دیر بعد جب اندر داخل ہوئے تو پہلی حیرت ان سیلے سرخ اور گلابی پھولوں کو دیکھ کر ہوئی جو بیرونی دروازے کے ساتھ پردے کی دیوار سے آگے قطار در قطار مسکراتے ہوئے جیسے خوش آمدید کہتے ہوں۔ جب اور آگے بڑھے انگنائی میں قدم رکھے تو گل و گلزار کا ایک جہاں دیکھا۔ کہیں پھولوں کی کیاریاں ہنستی تھیں کہیں سبز گھاس کے قالین حیرت زدہ کرتے تھے کمرے میں موجود اسلام آباد پشاور اور چترال سے آئی لڑکیاں فریال صمد، ماریہ کلثوم، صائمہ اور فہمیدہ کس درجہ مہذب اور شائستہ تھیں کہ خوشگوار حیرت نے بہت دیر تک جکڑے رکھا چھوٹی سی تپائی پر گھر کے درختوں سے توڑے ہوئے ٹھنڈے اور سیلے آلو بخارے اور خوبانیاں سج گئیں۔

اور گفتگو کا سلسلہ اردو اور انگریزی میں شروع ہو گیا۔ پڑھا لکھا کھانا پیتا وضع دار گھرانہ جسکی بیٹیاں پاکستان کے مختلف شہروں میں بکھری ہوئی تھیں اور اب بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے نیلے آئی ہوئی تھیں۔

سبزے کے قالین پر بیٹھ کر ہم نے دو پہر کا کھانا چار بجے کھایا جو مکھن پالک ساگ، بسی اور چولہے کی پکی موٹی روٹی پر مشتمل تھا۔ ساگ اور مکھن دونوں لذیذ تھے۔

پھر جیسے یادوں کی بارات میرے ذہنی آنگن میں اتر آئی۔ ایک مخصوص باس ایک پھیلا

ہوا منظر مجھے وہاں لے گیا جہاں درانتی سے مکتی کا چارہ کاٹتے ہوئے میں افق کو گھورتے ہوئے بے اختیار اپنے آپ سے کہا کرتی تھی۔ بھلا میں چھٹیوں میں ماں جی کے پاس یہ مشقت بھرے کام کرنے کیوں آجاتی ہوں۔ مار چارہ کٹوا بھالن (اینڈھن) اٹھوا گوبر تھپو تھپو اکر میرا بھرتہ بنا دیتی ہیں۔

سارے میں لوسن کے دو فنٹ اونچے پودے کھڑے تھے اور ارشاد بابا کی والدہ درانتی سے چارہ کاٹ رہی تھیں۔ میں نے بہتیرا ان کے ہاتھ سے درانتی پکڑ کر چارہ کاٹ کر ماضی کی یادوں کو زندہ کرنا چاہا پروہ نہ نہ کرتی رہیں۔

میں نے لمبے لمبے سانس بھرے کھیتوں سے اٹھتی ہوئی اس مخصوص باس کو اپنے اندر محفوظ کیا اور سیبوں کے باغ کو دیکھا جہاں درخت پھلوں کے بار سے کسی دولت مند صاحب حیثیت عاجز انسان کی طرح جھکے پڑ رہے تھے۔ گھر سے ملحقہ یہ زمین یہ باغات سب اس خاندان کی ملکیت تھے۔

رات کے کھانے پر دسترخوان پر وہی کچھ سجا ہوا تھا جو بالعموم میدانی علاقوں میں دعوتوں میں نظر آتا ہے۔ شامی کباب، پلاؤ، چکن روسٹ، دہی، سلاد۔ سلاد میں اہم چیز نیاز بو کے پتے تھے جنہیں ہم نے مقامی کلچر کی روایت سمجھتے ہوئے ذوق و شوق سے کھایا۔

اس شب کا پہلا دلچسپ پہر ارشاد بابا کی پھول کی طرح نازک والدہ جتنکے چہرے سے شفقت قندیل کی روشنی کی طرح پھونتی تھی کے ساتھ گزرا۔ پرانے وقتوں کے ثقافتی عروسی ملبوسات گھوڑوں پر بارات اور باراتوں کا دنوں ٹھہرنا تفصیلات میں الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا طلسم۔ پر اس منظر میں کلائنگ اس وقت آیا جب منقش چوبی ڈبے آئے اور نشست گاہ کے قالین فرش پر یاقوت نیلم، زمرد اور زرقونوں کے گلابی، ہبز، سفید اور سرخ پتھر بکھر گئے۔ اللہ میں نے حیرت اور شوق کی بلند یوں سے انہیں جھکتے ہوئے چھو کر دیکھا میرے بچپن کے جھللاتے رنگین خوابوں کے یہ عکس اس وقت میرے سامنے پڑے تھے۔ ہر روز جب میں بادشاہوں کی کہانیاں پڑھتی انکے زمرد یا قوت

اور ہیروں جیسے جواہرات سے پُر خزانوں کی تفصیلات اور ان کی ملکاؤں کے سروں گلوں اور ہاتھوں کو چار چاند لگاتے زیورات کا احوال پڑھتی تو سارا دن گویا بے کلی میں گزرتا۔ رات آتی اور ہر شب میں اپنے پسندیدہ بادشاہ کی ملکہ بنتی اور ان ہیروں جواہرات سے خود کو سجاتی۔

اس وقت میں نے اپنے ننگے پنجھے ہاتھوں کو دیکھا۔ سونی کلائیوں پر نظر ڈالی خالی کانوں ناک اور گلے کو چھوا۔ کہیں رتی بھر سونا نہ تھا۔ کبخت جو بادشاہ نصیب ہوا تھا وہ کور ذوق ہی نہ تھا حسن و نظر کی لطافتوں سے بھی بے بہرہ تھا۔ مجال ہے جو کبھی پہنا اوڑھا سراہا ہو۔ دھیرے دھیرے اس مردہ طرز عمل نے نسوانی حیات کا بی ہی مار دیا۔

ایک بار پھر میں نے فرش پر بکھرے ان پتھروں کو دیکھا۔ میرے خوابوں نے انہیں چمکدار آنکھوں کو خیرہ کرتی شعاؤں کا خیالی روپ دے رکھا تھا۔ پرانکی صورت تو بڑی ڈل تھی۔ ارشاد بابا کی چھوٹی بہن جسکے میاں اسلام آباد میں مرکزی حکومت کے بڑے عہدیدار تھے۔ بڑے شاکی لہجے میں سور بند (گلے کی پٹی) کو ہاتھوں میں پکڑے کہہ رہی تھی۔ ہماری اماں انہیں کلیجے سے لگائے بیٹھی ہیں یہ نہیں کہ ایک ایک بیٹیوں کو عنایت کر دیں۔

ارشاد بابا کی والدہ بیٹی کے گلے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ پہلے تو بہوؤں کا حق ہے انہیں پناہ کر تمہیں دیکھوں گی۔

گزشتہ دنوں نوادرات اکٹھے کرنے والی غیر ملکی سیاحوں کی ایک ٹولی ان سے بہت سے قیمتی پتھر کوڑیوں کے مول خرید کر لے گئی۔ فریال صدانکی نواسی نے کہا۔ غیر ملکی سیاح یہ کام بھی کرتے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ملکہ وادی کی ایک خاتون نے ایسے ہی پتھر تقریباً بیس ہزار کے بیچے ہیں۔ انکی تراش خراش کے بعد تو یہ لاکھوں میں جاتے ہیں۔ غیر ملکی ایسے ہی ان وادیوں میں خنجر ہوتے نہیں پھرتے۔

میرے مولا میرے ملک کے جوہریوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ معلومات کی کمی ہے یا

آرام طلبی مشقت کی راہ میں مانع ہے۔ اس حیرت انگیز انکشاف پر مجھے شدید دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔

شب ببری جس کمرے میں ہوئی وہ کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر اس وقت ہم قطعی طور کتابیں دیکھنے اور رسالے پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ آرام دہ بستر پر لیٹے اور سونے میں عافیت جانی۔

میں شدید قسم کی پینڈو ہوں۔ لاہور جیسے شہر میں ہوش سنبھالنے اور جوانی گالنے کے باوجود ماڈرن ازم کی بہت سی عادتوں نے میرے ساتھ یاری نہیں گانٹھی۔ ٹھیٹ دیہاتیوں کی طرح نور پیر کے تڑکے نیند کو میری بند پلکیں کھول کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگنے کی بیقراری ہوتی ہے۔ اب میں لاکھ اسکے طرے کروں منتیں کروں ہاتھ جوڑوں کہ میری آنکھوں میں دوبارہ آ جاؤ اور بڑے لوگوں کی طرح نو دس بجے تک میرے ساتھ رہو۔ مگر مجال جو اس ڈھیٹ ہڈی کے کانوں پر جوں بھی ریٹے۔

اُس صبح بھی یہی ہوا۔ سارا گھر سوتا تھا جب میں آنگن میں آ گئی۔ گھر کے کشادہ لان میں پیراشوٹ کے رنگین خیموں نے مجھے حیران کیا۔ تھوڑی ہمت کی ایک خیمے کا پٹ اٹھا کر اندر جھانکا تو پشاو اور اسلام آباد کی ساری لڑکیاں میٹرس بچھائے وہاں سو رہی تھیں۔

پٹ میرے ہاتھ میں تھا اور پاکستان کا لڑکپن میرے سامنے تھا۔ نو دس سالہ اس کھلنڈرے لڑکے کے دل لاہور شہر کے گٹی کشمیری اور لنڈا بازار پیراشوٹوں سے بھرے پڑے تھے۔ دیگر عورتوں کی طرح میرے گھر کی مہاجر عورتیں بھی انہیں چاہتوں سے خرید کر لاتیں، ادھیڑ تیں، شلواروں میں جوڑ ڈالتے۔ قمیضوں اور کرتوں میں لیر لیر کا حساب جڑتا۔ سوٹ تیار ہو کر ڈھلتا کونکوں کی استری سے پرپس ہوتا۔ تن پر کیا آتا چمک دمک سبک پن نفاست اور ملائمت کا ایک بازار سج جاتا۔

سامنے کیاریوں میں کھلے گلاب صبح صادق کی روشنی میں ہنتے تھے۔ سورج مکھی کے

پھول مسکراتے تھے۔ میں نے ان سب سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی کنڈی کھولی نماز کے لئے میرے سامنے دو جگہیں تھیں۔ پتھر کا بڑا سا چبوترہ اور سامنے ایک کمرے کی مسجد۔

چبوترہ قابل ترجیح تھا کہ نظارے سامنے تھے۔ ذرا سا رخ پھیرنے پر دائیں تھے۔ بائیں تھے۔ اُس صبح دعائیں نہیں مانگی گئیں۔ دل سے اٹھتی آوازوں اور نظروں کی زبان کا تصادم اس طرح بار بار ہوتا تھا کہ الفاظ کے لبوں پر آنے سے قبل ہی آنکھیں کسی زاویے میں الجھ کر نہیں بولنے سے روک دیتیں۔ میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے ”مولا سائیں اللہ سائیں تو تو میرے اندر کا حال جانتا ہے“ کہتے ہوئے ڈھلانی راستے پر اترتی گئی۔ ایک جگہ جا کر اس ڈھلان کا ایک سرا نیچے اترتا تھا اور دوسرا دورویہ درختوں سے گھرا سیدھا معلوم نہیں کہاں جاتا تھا۔ چیختے چنگھاڑتے گلابی رنگ کے کپڑوں میں ایک نو عمر سی لڑکی سر پر چھوٹی سی پوٹلی دھرے ایک ادھیڑ عمر کے مرد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

چائے اور پو پھٹی کے ناشتے کے بعد دو شخصیات سے ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ پہلی تو ارشاد کے بڑے بھائی عنایت اللہ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ تھے۔ انکی تدریسی زندگی کی ابتدا کالا ش کی وادیوں، بمبوریت، ریمبور اور بریر سے ہوئی۔ دس سالہ اس طویل قیام نے انہیں کالاشیوں اور انکے کلچر پر ایک اتھارٹی کی حیثیت دلوائی۔ اپنے تجربے اور علم کو انہوں نے تحریری صورت بھی دی ہے۔ تھیمس، کتابی صورت، کسی ماہنامہ کسی سہ ماہی پرچے میں اسکی چھپائی کا اہتمام عمل کی کونسی راہ بہترین ہے۔ کا تعین نہیں ہو پارہا تھا۔ یہ بھی سننے کو ملا کہ بہت سے لوگ اس مواد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیچھے سرگرداں ہیں۔ مگر وہ کسی کو پلہ نہیں پکڑا رہے۔ اسے جب انہوں نے میرے سامنے لا کر رکھا تو اسکی بلکی سی پھولا پھردلی کے ساتھ ہی بلکن کے الفاظ میں

Some few to be read wholly with diligence and

attention .

والی صورت نظر آئی۔ پر ہوا یہ کہ چند ہی لمحوں بعد وہ سُرخ فائل انہوں نے آہستگی سے یوں اٹھائی جیسے کوئی زیرک اور زمانہ ساز بوڑھی ساس اپنی نئی نویلی بہو کو اپنے کسی رنڈی باز بد معاش داماد یا قریبی رشتہ دار کے سامنے سے کسی ناگہانی خطرے کے پیش نظر اٹھالے جائے۔

فی الواقع جی تو میرا بھی بد معاش داماد کی طرح اس ذلہن کو جھینا مار کر لے اڑنے کو چاہ رہا تھا کہ ایسی نادر چیز تو کہیں نصیبوں سے ملتی ہے۔ پر مجھ میں دم خم کتنا تھا۔

دوسری شخصیت ۱۵۰ سالہ جناب جمعدار صاحب کی تھی۔ ربڑ کے لمبے بوٹ خستہ حال پینٹ اور خاکی قمیض پر جیکٹ ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے اور چہرے پر بھی کہیں کہیں اسکی گل کاری نظر آتی تھی۔ چشمے پر تیز پانی کے بہاؤ والی جگہ پر ایک چھوٹے سے کمرے میں پن چکی کا کام زمانوں سے سنبھالا ہوا تھا۔ صحت مند باہمت اور پُر عزم اس شخص کی باتیں قابل تہلیل تھیں۔ حال کی بجائے ماضی سے زیادہ پیار تھا۔ وہ دن جب اخروٹوں سے پاپلر کے سوکھے چربی لگے درختوں اور دیودار کی سپیشل لکڑی سے گھر روشن ہوتے۔ ان دنوں میں بہت زیادہ برف باری ہوتی۔ بہت مزا آتا۔ اب زندگی بہت بدل گئی ہے۔

پھر محبت اور خلوص میں پورم پور ڈوبے اس گھرانے سے رخصت ہوئے۔ برساتی نالے پر اس گھر کے سربراہ جناب محمد دبور خان سے ملاقات ہوئی جو جماعت اسلامی مستوج کے امیر ہیں اور اپنی جماعتی سرگرمیوں سے متعلقہ کاموں کے سلسلے میں دور افتادہ وادیوں کے سفر سے آرہے تھے۔ ہماری جانب سے رسمی جملے انکی جانب سے دعائیہ الفاظ کے ساتھ ملاقات کا خاتمہ ہوا۔

جب نشیب سے فراز پر آئے تو پل روڈ پر جا بجا سُرخ جھنڈے لہرا رہے تھے اور سبز پتوں سے محرابوں والے دروازے بن رہے تھے۔ ”یہ سب کس سلسلے میں؟“ میرا استفسار تھا۔

”چترال۔ کاؤٹ کا ایک نوجوان کارگل میں شہید ہوا ہے اسکی میت کے استقبال کی

تیا ریاں ہیں۔“

”سبحان اللہ۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

دار بند روڈ پر ارشاد بابا نے اپنی جیب روکی۔ وہاں موجود نو جوان کے ایک ٹولے سے وہ خاصی دیر تک کھوار میں باتیں کرتا رہا۔ پتہ چلا کہ نو جوان ارشاد سے ہمارے بارے میں جاننے کے خواہشمند تھے۔ ہمارے شناختی کارڈوں کا مطالبہ تھا۔ اور ہم پر انڈیا کے جاسوس ہونے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ ارشاد نے ہنستے ہوئے بتایا کہ اُس نے اُن کی تسلی کر دی ہے۔

دراصل تحصیل موڑ کہو کی ہندوک وادی کے ایک سپاہی نے پاکستانی فوج کے ایک میجر کو انڈیا کے لیے جاسوسی کرتے ہوئے پکڑوایا ہے۔ اسی لیے لڑکے بالے کچھ زیادہ حساس ہو گئے ہیں۔

چترال واپسی پر سب سے پہلا کام نہانے کا کیا۔ اللہ سچا جانتا ہے تن سے اتنا میل اُترا تھا کہ ہاتھ روم گد لے پانی سے بھر گیا۔ سچے مولا سائیں تیرا پانی کتنی بڑی نعمت ہے من کا گند تو نہیں اُترتا پرتن کا اُتار کر سریر کو کیسا ہلکا ہلکا کر دیتا ہے۔

## بارون ترچ میر اور میں

یقیناً اس وقت لیوں پر بڑی شہد اگیں قسم کی مسکراہٹ ہوگی۔ سر تو سجدے میں پڑا تھا پر ہونٹ جو پڑھنا تھا جیسے بھولے بیٹھے تھے۔ ذہن سارے وجود کو خوشخبری کا وہ گنگنل دے رہا تھا جس کا اذن مجھے آج شام چترال بازار میں ملا تھا۔ کل ترچ میر کے دامن بارون میں سجدہ ہوگا۔

کس قدر اتفاقیہ ٹکراؤ تھا۔ عین ہمارے پروگرام سے میچ کرتا۔ کرنل متاع الملک کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر حیدر الملک اتالیق بازار میں ملے۔ خیر و عافیت کے رسمی الفاظ کے بعد جب یہ سننے میں آیا کہ افراد خانہ کل راجہ صاحب کے ہمراہ اپنے گرمائی مستقر بارون جا رہے ہیں تب جانے کیسے زبان سے نکل گیا۔

”کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ ایک دن کے لیے ترچ میر کے نظاروں سے محفوظ ہو آئیں۔“

”شیور (sure)۔ نرم خود اکثر کی زبان سے نکلا۔ کل دس بجے گاڑیاں روانہ ہوں گی۔ نو بجے تک شغور محل پہنچ جائیں۔“

مہر النساء کچھ جزبزی تھی وہ گرم چشمہ کی پری خوان سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔

”ارے ہمیں وہیں سے تو جانا ہے اچھا ہے سفر ٹوٹ جائے گا ایک اور خوبصورت جگہ کا نظارہ بھی کر لیں گے۔“

سچی بات ہے صورت حال من و عین اُس شعر کے حسب حال تھی کہ یہ عالم شوق کا دیکھا

نہ جائے ہے۔ شب بھر خوابوں میں بھی تریج میر کے چہ چہ رہے۔ صبح سویرے پاؤں تو جیسے Skates پر چڑھ گئے تھے۔ زکو۔ تھمو۔ پلیز ذرا دم لو ناشتہ تو ڈھنگ سے کرنے دو۔ جیسے الفاظ کی تکرار مہر النساء کی طرف سے وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اڈے میں سواریوں کا انتظار کون کبخت کرتا۔ سالم گاڑی بک کی۔ شغور محل کے سامنے کھڑی گاڑیاں دیکھ کر چکریاں کھاتا وسوسوں میں ڈولتا دل سکوں پذیر ہوا کہ ہمیں چھوڑ نہیں گئے۔ راجہ صاحب اور ان کی فیملی سے ہیلو ہائے کی اور چائے پانی کے بعد مہر النساء پرانا محل اور میں بہشت کے اس نکلے کو دیکھنے کے لیے ابھی جسکی دوبارہ دید کی مجھے تمنا تھی۔ پر یہ کیا باغ تو اجڑا پڑا تھا۔ اسے کیا ہوا؟ اضطراری کیفیت میں میری زبان سے نکلا۔ اوپر کے پہاڑوں سے برسائی طغیانی کا ریلہ اتنا شدید اور زور آور تھا کہ اس کے ساتھ زنان خانے کا پرانا حصہ بھی تباہ ہو گیا۔ اب کف افسوس کتنی دیر ملتی۔ کرنل مطاع الملک کی منجھلی بہونے راستے میں جائیداد کی تقسیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ پرانا محل ہمارے حصے میں آیا ہے۔

چلتے چلتے رک کر میں نے اُسکے ہاتھ تھامے۔ سُرخ و سفید چہرے کو محبت سے دیکھا اور

کہا۔

”ہنزہ کے محل کی طرح آپ بھی اُسے سیاحوں کے لیے وقف کر دیں۔ نکلٹ لگا

دیں۔ جو چاہیں کریں پر اُسکی تاریخی حیثیت مجروح نہ کریں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔

”میں آپکی تجویز سے اپنے میاں کو ضرور آگاہ کروں گی۔“

جب اذن سفر ملا اسوقت میں مسز وقار الملک کو یہ سمجھانے میں جتنی ہوئی تھی کہ وہ نہیں

جانتی ہیں کہ اُنکے اثاثے تاریخی لحاظ سے کتنے قیمتی ہیں۔

شغور کا چوٹی برج کر اس کرنے کے بعد نالہ اوڈور کے ساتھ سفر شروع ہوا۔ سڑک سے

بارون تک کا علاقہ اوڈور کہلاتا ہے۔ ستر اسی گھروں پر مشتمل سیواضت گاؤں کے بعد حسن آباد جیسی

کھلی وادی دیکھنے کو ملی۔ یہاں نالہ بہت نشیب میں بہتا تھا۔ آگے چڑھائی تھی۔ بھیل درمیر کی وادیاں گزریں۔ تقریباً 7000 فٹ کی بلندی پر ”اورغوج“ کی وادی ہے جہاں راجہ صاحب کا باغ ہے انکی زمینیں ہیں انکے مزارع اور انکے گھر ہیں۔ یہیں پڑاؤ ہوا۔

راجہ صاحب کی بہوؤں نے اسے پکنک ٹرپ کے طور پر ارنج کیا ہوا تھا۔ چائے کا سامان شامی کباب، ویجی ٹیبل روٹز اور نمکو جیسی چیزیں موجود تھیں۔ سکولوں میں پڑھنے والے ان کے بچے ماؤں کے ساتھ کھوار اور اردو میں بات کرتے درمیان میں کہیں کہیں انگریزی کے ٹوٹے لگاتے۔ پیلوں سے لدے پھندے باغ میں انکی چھاؤں تلے اوننی در یوں پر کھلے ڈھلے انداز میں بیٹھ کر چائے پینا شامی کباب اور ویجی ٹیبل روٹز کھانا کس قدر دلچسپ اور پُر لطف کام تھا۔ ٹھنڈی ٹھار ہوا میں دل و دماغ کو سرشار کرتی تھیں۔

درمیان میں تھوڑا سا ستانے اور چائے پینے سے تازہ دم ضرور ہوئے تھے پر عمودی چڑھائی اور کہیں اترائی کا ایک ایسا سلسلہ تھا کہ لگتا تھا جیسے چڑھتے اترتے ایک جگ بیت گیا ہے۔ سو سو مکنی اعتبار سے قابل رشک تھا نام کی نسوانی غنایت زیر لب جتنی بار بھی دہراؤ نیا صوتی لطف پاؤ۔ سو سو مکنی لیڈی کونسلر اور مرد ناظم وادی کے رفاہی کاموں کے لیے سرگرم عمل۔ عورتوں کی شرح خواندگی زیادہ انگریزوں کا انگلش میڈیم سکول چلاتا۔

ایک تو سمندر پار والی یہ چنی چنی سمجھ و فہم سے بالا ہے۔ کجخت مارے کیسے جنونی ہیں۔ کوہ قافوں میں کہیں انسانوں اور زبانوں پر ریسرچ کرتے پھرتے ہیں دنوں نہیں مہینوں نہیں سالوں پناہ گیروں کی طرح تیرے میرے گھروں میں ڈیرے ڈالے رکھتے ہیں۔ جیسے گھر سے دیس نکالا ملا ہو جیسے پتھر کے ہوں۔ کوئی خون کارشتہ کبھی یاد نہ آئے۔ کہیں مشنری جذبوں کے اسیر ہو کر بھولے بھالے لوگوں کو مسیحی بنانے کے نیک کام پر عمل پیرا ہیں۔ کہیں تعلیم و تدریس کے نام پر خدمت ہو رہی ہے۔ جہاں مرضی چلے جاؤ جتنی چاہے بلندیاں چڑھ جاؤ انکا دیدار ضرور ہو جاتا

کیار کے پارک گراؤنڈ میں آ کر گاڑیاں رُک گئیں۔ یہ ایک طرح وادی کی گاڑیوں کا

اڈہ تھا۔

شکر ہے مولا تیرا۔ کہیں پہنچے تو سہی۔

اب یہ کب ممکن تھا کہ میں گاڑی سے اتر کر کسی نظر باز اور دل پھینک عاشق کی طرح اس نئی جگہ کے کھیتوں کھلیانوں گھر گھر وندوں اور انکے چھوٹے بڑے مکینوں شجر حجر اور وادی کو حصار میں لیے چوکس پاسبانوں سے آنکھیں نہ لڑاتی۔ سچی بات ہے میں تو حسن فطرت کے لیے دل نکال کر ہتھیلی پر رکھے پھرتی تھی اور صدائیں دیتی تھی کہ کوئی ہے جو اسے قبول کرے۔ اب ایسے سچے عاشق سے اگر کوئی منہ موڑے تو پھر معشوق کی بد قسمتی ہی ہے نا۔

پر جب آنکھیں لڑا کر واپس لوٹی تو مجھے محسوس ہوا جیسے ہندوکش کی چھوٹی بڑی چوٹیاں لڑھک کر یہاں آ گئی ہیں۔ میرا مولا جھوٹ نہ بلوائے سامان کے انبار لگے پڑے تھے۔ یہ ایک ماہ رہنے کے لیے یہاں آئے ہیں یا نقل مکانی کر لی ہے۔ حیرت آنکھوں سے پھوٹی پڑنے کے باوجود ہونٹوں میں دبی پڑی تھی۔

میری آنکھوں کے دیدوں میں مروت و لحاظ کا پانی ابھی نہیں ڈھلکا تھا۔ اسی لیے میں نے چور آنکھوں سے سامان کے حجم اور انکے بھاری اور ہلکے پن کے ساتھ ساتھ افراد تعداد انکی قد و قامت جسامت اور طاقت کے اندازے لگا کر اپنے لیے فلاں فلاں ہلکی پھلکی اشیاء اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پر میرے ساتھ یہ بھی بات تھی کہ میں حال موجود صورت کا صحیح فہم و ادراک نہ کر پاتی اپنے اسی مڑے مڑے ماڑے موٹے پس منظر میں ڈوبی رہتی۔ بھلا میں کسی ہماشا کی مہمان تھی۔ چترال کے مہتروں کا خاندان میرا میزبان تھا جن کی لمبی چوڑی زمینوں کے سلسلے میں یہاں تک دیکھتی چلی آئی تھی۔

اور پل بھی نہ لگا بے شمار انسانی ہاتھوں کے بلڈوزروں نے ہندوکش کی چھوٹی بڑی

چوٹیوں کا صفایا کر دیا۔

”چلیے“ ڈاکٹر حیدر کی مسز مسکرائیں۔

میری جو ابی مسکراہٹ کے ہونٹوں پر جو طمانیت اور سرشاری بچی تھی اسکے مفہوم سے صرف میں آشا تھی۔

کیار کی ٹیڑھی میڑھی تنگ و کشادہ گلیوں میں جن سے ٹکراؤ ہوا ان میں خوبصورت چہرے والی عورتیں تھیں جنکی مسکراہٹوں میں دوستانہ رنگ تھا۔ بوڑھوں میں اس راجہ فیملی کے لیے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر آداب کہنے میں نیاز مندی تھی۔ بچوں کی آنکھوں میں حیرت اور بے نیازی کا عنصر تھا۔

کیار کی نانوے فیصد آبادی اسماعیلی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں تیز اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل پیرا۔ گاؤں میں بجلی ہے سکول، ڈسپنری ہے پولو گراؤنڈ اور جماعت خانہ بھی ہے۔ جس پہاڑ کے سینے پر چڑھ کر ہمیں اوپر بارون جانا تھا اسکا حسن و بانگین تو حیران کرتا تھا۔ سبز ریشمی گھاس سے ڈھنپا نیلے کاسنی آشتی جنگلی پھولوں سے سجا۔ ایک میل کی چڑھائی تھی۔ پر اسنے اپنے رنگ و روپ کے زور پر اس مشقت کو عین راحت میں بدل دیا تھا۔ عمر رسیدہ کرنل مطاع الملک بغیر کسی چھڑی سہارے کے جوانوں کی طرح چڑھائی چڑھتے تھے۔ رشک سا محسوس کرتے ہوئے میری سوچ تھی کہ انکے گئے گوڈوں میں ہڈیوں جوڑوں میں پہاڑوں کی ان مسافتوں سے دیرینہ یاری ہے تبھی تو ساتھ نبھایا جا رہا ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم جیسے جوان پھر بھی ہانپ ہانپ جاتے تھے۔

ایک میل کی چڑھائی چڑھ کر میں بارون میں نہیں علامہ اقبال کی ”ایک آرزو“ سیموئل راجرز کی ”A WISH“ کی جنت میں داخل ہوئی تھی۔

دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔

گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑوں کے سینے پر تقریباً تین میل کے رقبے پر پھیلے وسیع

دعویٰ قطعے پر کوہساروں کے دامن میں ایک اکلوتا جھونپڑا تھا۔ سمر کالج۔  
 تریج میر کی چوٹیوں سے بہتا چشمے کا پانی اس سناٹے سے لبریز فضا میں گویا جابجا بارہا  
 تھا۔

فضا کسی خاندانی ازلی امیر کی طرح خوشبوؤں کے خزانوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہیں اس  
 میں پھولوں کی باس کا رچاؤ تھا کہیں پھلوں کی خوشبو حیات کو چوکنا کرتی تھی۔ کہیں گندم جوار  
 اور باجرے کے کھیتوں پر سے پھیلتی ہوئی ماضی کے درتے وا کرتی تھی۔ خوشبو کتنی جاندار ہے پل  
 جھپکتے میں آپکے شعور چھوڑ لا شعور کی کھڑکیاں بھی چوہٹ کھول کر آپکو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی  
 ہے۔

سامنے تریج میر کی چوٹی کس قدر مائل بہ کرم تھی کہ لگتا تھا جیسے بازو وا کروں گی تو سینے سے  
 ہی چٹ جائے گی یا پھر میری گود میں لڑھک آئے گی۔  
 کالج تین بیڈرومز، سنگ روم ایک بڑے سے کچن اور سٹور پر مشتمل تھا۔ اس وقت کچن  
 میں کھانا پک رہا تھا افراد خانہ اور نوکروں کے ساتھ یہ ماحول جنگل میں منگل جیسی صورت پیش کر رہا  
 تھا۔

”آؤ چشمے پر چلیں۔“ مہر النساء نے اس وقت گویا میرے دل کی بات کہی تھی۔  
 چشمہ خاصے فاصلے پر تھا۔ اور صورت گری کچھ ایسی تھی کہ کہیں شکل چھپاتا اور کہیں خود کو  
 ظاہر کرتا تھا۔ فضا میں خشکی تھی اسی لیے ہم نے پھوار میں بھگینے سے گریز کیا۔ کیسا ٹھنڈا میٹھا  
 آانسٹوں سے پاک پانی تھا۔ آب حیات جان کر جو پینا شروع کیا تو وہ مثال خود پرفٹ میٹھی نظر  
 آئی تھی۔

ہو چھے جٹ کنورہ لبھا پانی پی پی ا پھریا۔

قسمت اگر ہمیں بارون کی جنت میں لے آئی تھی اور ہم تریج میر کی برف پوش چوٹیوں  
 کے اس آبی خزانے تک پہنچ ہی گئے تھے تو اب شکم میں موجود پرانی غلاظتیں دھونا اور آسندہ کے تین

دنوں تک اس کے فیض سے صحت یاب رہنا چاہتے تھے۔

ڈھلانوں پر اُگے رنگارنگ پھول ہم نے نہ چاہنے کے باوجود توڑے۔ اپنی چادر بچھا کر نماز پڑھی اور قبلے کی بجائے ترچ میر کی چوٹی کو دیکھتے ہوئے دعا مانگی۔ نماز میں سرور تھا سپردگی تھی دعا میں عجز تھا اور قبولیت کی آس تھی۔

کھانے میں آلو گوشت تھا۔ ہوش سنبھالنے سے لیکر جوان ہونے اور میکہ گھر چھوڑنے تک جالندھر کے مضافاتی گاؤں سے لاہور جیسے بڑے شہر میں آ بسنے والے میرے پناہ گیر خاندان کے لیے سالنوں میں سب سے مہنگا اور خاص یہی ہوتا تھا جسے ادھ پاؤ چھوٹے گوشت کے ساتھ ہفتے میں ایک یا دو دن اہتمام سے پکایا اور کھایا جاتا۔ یوں اگر اندازے کے دائرے کو مہینوں اور سالوں پر پھیلاؤں تو پھر حساب کتاب شاید سینکڑوں تک چلا جائے۔ پر یہ کیسا آلو گوشت تھا جسکے لیے ندیدہ پن میری آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ میرے ہاتھ چوتھی بار ڈونگے کی طرف بڑھے تھے اور میری زبان نے شرمندگی کے احساس کو زائل کرنے کے لیے کہا تھا۔

”ایسا ذائقہ دار آلو گوشت میں نے آج تک نہیں کھایا۔“

”آلو بھی بارون کا اور گوشت بھی یہاں کا۔“ مسز حیدر نے کہا۔ ”تجھی۔“ میں نے

اختصار سے کام لیا۔

عصر کی نماز پڑھ کر جب ہم چائے کے لیے اُس مخصوص جگہ پر آئے جہاں راجہ صاحب تشریف رکھتے تھے۔ میں نے پوچھا تھا۔ ”آپ یہاں سارا دن کیا کریں گے؟“

ترچ میر کے بولتے نظاروں سے دل بہاؤں گا۔ انکی کی کرسی کا رخ ترچ میر کی طرف تھا۔ چادر میں جسم لپٹا ہوا تھا پھر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اپنے چاروں طرف بکھری فطرت کی رعنائیوں کی جانب اشارہ کیا۔ یہ سب میرے پرانے سگلی ساتھی ہیں میرے ہمراز ہیں۔ پار افغانستان ہے۔ بسکی سرزمین سے میری حسین یادیں ہیں۔ بس اب ماضی کی وہ جنت اور دوزخ ہی ہے جس میں مجھے رہنا ہے۔

ہاں واقعی حال کے ان لمحوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور تکلیف دہ شغل اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔

چائے کے کپ ہاتھوں میں تھام کر سرشاری کی حالت میں ترچ میر کو دیکھنا گویا پیدا کرنے والے کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھنے کے مترادف تھا۔

اب ہم پھر سیر کے لیے نکلے۔ گندم بیچاری کے ابھی کٹنے مرنے کے دن کچھ دور ہی تلتے تھے۔ مکئی پر جو شباب اور نکھار تھا وہ آنکھوں کو حیران کرتا تھا۔ خوبانی کہیں نظر نہ آئی تو میں نے کمپنی دینے والے راجہ فیملی کے بچوں سے پوچھا۔

”یہاں خوبانی نہیں ہوتی۔“ جواب ملا تھا۔

میں حیران ہوئی ایک ہی جیسی آب و ہوا اور زمین کے ہوتے ہوئے ایسا کیوں۔

یہاں سیب بھی نہیں ہوتے۔ بابا نے ایک سیب کا پودا لگایا تھا جس پر ابھی تک پھل نہیں لگا۔ ڈاکٹر حیدر کی بڑی بیٹی باتیں کرتے ہوئے کس قدر معصوم نظر آتی تھی۔

چلنے میں آ پکو وہ سیب کا اکلوتا درخت دکھاؤں۔

اب ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ تیز ہواؤں نے درختوں کی شاخوں اور کمزور ٹہنیوں کو لمبے لمبے جھلار دینے شروع کر دیئے تھے۔ جس سے فضا میں شور اور سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

میں نے ترچ میر کو دیکھا۔ اسکے چہرے پر بادلوں کے چند ٹکڑوں نے نقاب ڈال دی تھی۔ یہ بادل ننھے اس وہمی ماں کی طرح نظر آئے تھے جو اپنے خوبصورت بچے کو لوگوں کی نظر بد سے بچانے کے لیے گھر میں رکھنے کے جتن کرتی ہے۔ میں تو شام کے ان لمحوں کی منتظر تھی کہ جب سورج کی آخری کرنیں ترچ میر کی پیشانی چوم کر اپنے مدار میں لوٹیں تو یہ دیکھ سکوں کہ رنگوں کی کونسی پچکاری کا اسکے چہرے سے چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ اور اب یہ اُمید خاک میں مل گئی تھی۔

الٹین کی روشنی میں کمرہ کتنا ہڈ اسرار لگ رہا تھا۔ دیواروں پر ہماری پر چھائیوں کے عکس بڑے بڑے ڈھبے اور خوفناک سے تھے۔ باہر ہواؤں کی چیخ و پکار تھی اور کمرے میں پوہ ماگھ کی سردی

اُتری ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے بلاوے پر دوسرے کمرے میں جانا پڑا تھا۔  
 باہر بڑھول تاریکی تھی۔ سردی تھی اور فضا پر چھائے سنانے پر ضربیں لگانے والی چشمے  
 کی مسلسل گونج تھی۔

کھانے میں پلاؤ تھا۔ ٹماٹر پیاز ہرے دھنیے کا سلاد اور راجہ صاحب کی ترچ میر سے  
 متعلق کہانیاں تھیں۔

زمانوں پہلے صدیوں پہلے یہ ملک پریوں کی راجدھانی تھا۔ ترچ میر کی یہ چوٹی پری  
 زادیوں کا دار الخلافہ تھا۔ یہاں انکے بادشاہ کا سونے کا محل تھا۔ یہ پری زادیاں سونے کے بستروں  
 پر سوتیں۔ طلائی برتنوں میں کھانا کھاتیں۔ سونے کے تالابوں میں نہاتیں۔ انہیں فنون لطیفہ سے  
 گہری رغبت تھی۔ سلیقہ اور ہنرمندی انکی پور پور سے نیکتی تھی۔ وہ مٹی اور لکڑی کے ایسے خوبصورت  
 برتن بناتیں۔ چادروں تکیوں اور ملبوسات پر ایسی کشیدہ کاری کرتیں کہ انکا شہنشاہ دنگ رہ جاتا۔ پھر  
 یہ برتن کھلوانے چادریں اور ملبوسات لوگوں کے گھروں میں پھینک دیئے جاتے۔ لوگ انہیں  
 دیکھتے حیرت زدہ ہوتے اور ڈرتے ڈرتے انہیں استعمال کرتے۔ اور یوں ہی لوگوں نے دھیرے  
 دھیرے خود ایسے برتن کھلوانے اور دیگر چیزیں بنانی شروع کر دیں۔

جب سونے کے لیے لینے تو وہ کہانی یاد آئی۔ کسی جنگل میں ایک کنیا تھی۔ بارون کے  
 اس جنگل میں یہ بھی ویسی ہی ایک کنیا تھی۔ جسکی بلند چوٹیوں سے برفانی چھتے بھیڑیے اور ریچھ اُتر  
 کر ان چوٹی دروازوں کا تیا پانچہ کرتے ہوئے ہمیں اپنا لقمہ بنا سکتے تھے۔ آیت الکرسی کا دم درود تو  
 کیا پھر بھی شب بھرا لے سیدھے خیالوں سے ہی ہلکان ہوتے رہے۔

صبح دم ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی جب میں نے باہر کی طرف دُھڑکی لگائی صد شکر کہ ترچ میر  
 کے چہرے پر اسوقت کوئی نقاب نہیں تھی۔ مجھے اپنی کیفیت پرانے وقتوں کے اس دل پھینک عاشق  
 لونڈے کی سی لگی جو مٹی جون کی آگ برساتی دوپہر میں اپنی محبوبہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے  
 چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ سرد ہواؤں کے جھکڑتھے اور میں تھی ترچ میر تھی اور میری پیاسی آنکھیں

تھیں۔

پھر جیسے ایک کوندا سا لپکا ایک لشکارہ پڑا۔ روشنی کا تاریخی رنگ بکھرا۔ دھیرے دھیرے اس کا چہرہ اسیس نہاتا گیا۔ میں دیکھتی گئی دیکھتی گئی۔

پھر اٹھی اور کمرے میں آ کر کبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ ناروتجین کتنے جیالے تھے جو جان بہتیلی پر رکھ کر اس پر پہنچے۔

وقت رخصت میں نے اُسے پھر دیکھا تھا۔

اور دم واپس وہ سب بڑے چھوٹوں سمیت ہمیں خدا حافظ کہنے کو موجود تھے۔ میں نے راجہ صاحب کے ہاتھوں کو عقیدت سے تھاما اور کہا دلی شکر یہ آپکی محبت اور توجہ کا۔ کتنا اچھا ہوا اگر اس خوش خلقی کا خفیہ سا حصہ آپ اپنے عم زادوں شاہی قلعہ چترال اور محل کے وارثوں کو بھی منتقل کر دیں جنہوں نے ایسے جغادری دربان ڈیوڑھیوں پر بٹھا رکھے ہیں کہ جن کا ایک کڑ کا اچھے اچھوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میرے ہاتھ جو ابھی تک انکی گرفت میں تھے ان پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے گویا ہوئے۔

بھئی آپکا اور ہمارا رشتہ تو قاری اور لکھاری کا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہلکا

سامسکرائے چترال مرکزی جگہ ہے رکھ رکھاؤ کا اہتمام تو رکھنا پڑتا ہے۔

پھر میں نے انکی بہوؤں کے ماتھے چومے۔ اور رخصت ہوئے۔

## گرم چشمہ۔ پری خوان بشقر پائین و بالا

شغور محل کے سامنے سڑک کے کنارے درخت تلے کھڑے چمکتی دکتی آنکھوں کو چندھیاتی دھوپ میں ارد گرد کی چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہم نے سوچا بیٹھ جائیں کہیں۔ چترال سے گرم چشمہ جانے والی کسی گاڑی میں ہمیں یہیں سے جگہ یا لفٹ مل سکتی تھی۔

ابھی آدھ گھنٹہ کھڑی رہنے والی ٹانگوں کو پتھروں پر بیٹھ کر ستانے کا پل بھی نہیں ملا تھا کہ ایک ٹویوٹا سنگل کیبن موٹر مڑتی نظر آئی۔ دُڑکی لگائی اور عین اسکے سامنے خود کسشی کے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ گاڑی زکی۔ ایک نوجوان باہر نکلا۔ دو اندر بیٹھے رہے۔

”گرم چشمے تک لفٹ چاہیے۔“ مجھے بولنا پڑا۔

کیونکہ وہ خاموش مگر مجسم سوال کی صورت میں تنا کھڑا تھا۔

”یہاں کیسے؟“ اب پوچھ پڑتال شروع ہوئی تو صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔

روئید اڈسن کرطنزیہ اشارے اور ہنکارے چہروں اور ہونٹوں پر نظر آئے۔

”پیچھے بیٹھنا پڑنے گا۔“ لہجے میں رعونت بھی تھی اور بے نیازی بھی۔

مہر النساء کونسا کم تھی فوراً بولی۔

”آپ لوگ ہمیں آگے بٹھائیں اور خود پیچھے جائیں۔“

”سبحان اللہ۔“ زوردار قبہ فضا میں گونجا۔

”دیکھئے یہ ایر فورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ ہیں۔ اُس نوجوان کی طرف اشارہ ہوا جو ماشا اللہ چہرے پر جی بہت سی موٹی چیزوں کے ساتھ ساتھ موٹے تن و توش والا بھی تھا۔ اور یہ دوسرے صاحب کی طرف اشارہ ہوا۔ اٹلیکنس میں میجر ہیں۔ میرے مہمان ہیں۔ میں مردان سے ہوں اور لٹکوہ اپنے سسرال جا رہا ہوں۔ اس لیے میں بھی مہمان ٹھہرا۔ اب اتنے معزز مہمان پیچھے کیسے بیٹھیں۔“

بطور پرنسپل میری پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا ایر فورس کے سکول سے ہوئی تھی۔ ایر فورس کے افسروں اور جوانوں سے اکثر و بیشتر رابطہ رہتا۔ دھرتی کو ہلانے اور فضاؤں میں کمندیں ڈالنے والے ان سمارٹ سے جوانوں کا فالتو چربی سے بھلا کیا واسطہ۔ اس گولو مولو کو دیکھتے ہی میرا دل اس پرنسٹر چلانے کو مچلنے لگا۔ طنز بھرا نستر چلا۔ اس کا پھولا پھولا گول مٹول چہرہ لال بھجھو کا ہوا۔

”میں فلائز ہوں آپ کی اطلاع کے لیے۔“ وہ جیسے تریج میر کی چوٹی سے جھانکا۔

”ادہو۔“ میں نے بھی ہونٹوں کو دائرے کی صورت دی۔

”پھر تو اور بھی مشکل ہوئی۔ کاک پٹ میں تو پھنس جاتے ہوں گے۔“

نوک جھونک کا یہ دلچسپ سا سلسلہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھا تھا جب تحصیل لٹکوہ کے داماد نے اس قضیے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”تو آپ پیچھے بیٹھیں گی نا۔“

”ارے میاں کیوں نہیں بیٹھیں گے یہاں کونسا گاڑیوں کی ریل پیل ہے کہ چلو ایک ہنٹ گئی تو دوسری آ جائے گی۔ سو کھنے پڑے ہوئے تھے۔“

میں تو خیر ٹپوسی مار کر چڑھی اور بیٹھی۔ عادی جو تھی کہیں کونے کھدرے میں کہیں گئے گوڈوں میں کہیں شاخوں کی طرح ٹٹکتے ہوئے۔

ریت اور مٹی کے بگولے چہروں پر واری صدقے ہونے لگے تو ہم نے نقاب پوش

ذکوؤں کا روپ دھار لیا خدا کا شکر تھا کہ سورج کی تپش اور ہوائیں ایک دوسرے کو نچا دکھانے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ دگر نہ پٹا ہو جاتا۔ جیپ کے ہلکورے اور چار سو بکھرے نظارے۔ کہیں اگر میں جوان ہوتی تو ناچنا شروع کر دیتی۔ پھر پلاسٹک کے شیشے کی درمیانی دیوار سے ایک لفافہ ہماری طرف آیا۔ تازہ خوبانیاں واہ واہ کچھ کھائیں اور بقیہ سنبھالیں۔ ایک بار پھر گاڑی روک کر تواضع ہوئی چائے اور بسکٹ۔ جوانوں کا یہ روپ بڑا متاثر کن تھا۔

پلٹھوہک سے ذرا آگے گاڑی رک گئی۔ میں ہنسی اب کھانے کو کچھ اور ملے گا۔

پر اب جو کھایا تھا اُسے نکالنے کی باری آگئی۔ گاڑی سٹارٹ نہیں لے رہی تھی۔ زمینی اور فضائی فوج دھکوں میں مصروف ہو گئی۔ من پکے وجود کے ساتھ جے بیٹھنے پر شرم آئی۔

”مدد کروں۔“ میں ہنسی۔

”نیچے اتر آئیے۔ بس اتنی مدد کافی ہے۔“

مہر النساء بالکل نہیں اتری۔ زور سے چلائی۔ ”ارے میں تو ہوں ہی دھان پان سی۔“ میں نے کھایا پیا حلال کیا۔ نیک نعمتی اور ایمان داری سے دھکا لگایا۔

جب گرم چشمہ اترے تو ہمارے درمیان ماں بیٹوں کا رشتہ اُستوار ہو گیا تھا۔ اُس فلائٹ لیفٹیننٹ کو میں نے اپنے فلائٹ لیفٹیننٹ داماد کا پتہ دیا۔

میں نے تو بہتیرا چاہا کہ مہر النساء سب سے پہلے گرم چشموں کی زیارت کرے پر وہ صرف دو تریجات کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی پہلے نمبر پر پری خوان سے ملنا اور دوسرے پر بازار سے قیمتی پتھروں اور مقامی مصنوعات کی خریداری۔

”کیسے بگٹ بھاگے چلی جاتی ہو۔ کسی ریس میں حصہ لے رہی ہو کیا۔“ مہر النساء

تملانی۔

میں نے قدموں کو لگام ڈالی۔ درخت کے سائے میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ ہمیں پری

خوان سے اپنے کن مسائل پر دوا دار ولینا ہے۔

مہر النساء جوان بیٹے کی فرضی ماں بنی لڑکے کو کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا کر دیا۔ لڑکے کو بندے کا پتر بنانا مقصود ٹھہرا۔ میں نے میاں کی عشق بازی کو مرکز مسلہ بنایا۔

پری خوان کے بارے میں جس سے دریافت کیا اُس نے پہلے تو سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچا پھر کھوار میں کسی اور سے کچھ پوچھا تب وہ ہمیں ساتھ لے کر چلا۔ اونچے نیچے راستوں کی چڑھائیوں اترائیوں میں جب ہم ادھ موئے ہونے کے قریب تھے اُس نے ہمیں ایک جگہ کھڑا کیا قریبی توت کے درخت سے ایک ٹہنی توڑی اُسے ہمیں تھمائی اور بولا اُسے کھائیں میں معلوم کر کے ابھی آیا۔

”بھلا ایسی نابغہ شخصیت ہو اور بندہ کھوجتا اور چکریاں کھاتا پھرے۔“ مجھے تو سب رولا غولا لگتا ہے۔

جراغ تلے اندھیرا کی مثال سنی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ریلے اور بیٹھے توت کھاتے ہوئے مہر النساء اس درجہ اطمینان سے بولی تھی کہ مجھے اس پر قدرے غصہ بھی آیا۔ پھر جس تاریک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے اسکے وسط میں چولہے کی روشنی کی بجائے راکھ کا ڈھیر تھا۔ سیاہ دیواریں اور کمرے میں موجود چیزیں غربت کی دردناک عکاسی کرتی تھیں۔ اس تلخ اندھیرے میں گھری بیٹھی وہ نور جہاں چاند کا ٹونا لگتی تھی۔ پر اُس چاند سے ٹونے کی آنکھیں کیسی تھیں۔ کسی برے کی طرح آپ کے قلب و جگر میں چھید کرتی ہوئیں۔ اندر کے کرب کو لمبی زبان دیتی ہوئیں۔ ایسے میں بھلا مجھے شاعر کیوں نہ یاد آتا۔

Oh! Beware of eyes, the window to life.

Thy Soul and heart dipped in eyes, Betray

میرا سارا وجود لرزاتھا اور دل باہر بھاگ جانے کو چاہتا تھا کیونکہ میں شاعر کے ان اشعار

کی نمائندہ نہ تھی۔

What if a man is blind. Yet having eyes.

مترجم لڑکے نے ہم سے کہا اپنا مسئلہ بتاؤ۔ میں نے کہا ”اسے کہو ہم سے اردو میں بات کرے۔“

ابھی ہم لڑکے کے ساتھ سوال جواب کی چکر پھیریوں میں ہی تھے جب اُس چاند کے ٹوٹے پر آمد ہو گئی یوں کہ حسین آنکھیں میڑھی میڑھی ہوئیں زبان میں بھاری پن اور ہاتھوں میں ہلار آئے۔

جب مطلب پورا ہوتا نظر نہ آیا تو سب فراڈ بازی ہے۔ کہتے ہوئے میں نے مہر النساء کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ مترجم چیل کی طرح جھپٹا۔ ”تم پر عذاب آ جائے گا۔“ ”ارے آنے دو میاں۔“

”جل جاؤ گی۔“ وہ چلایا۔ ”چلو اچھا ہوگا۔“ لنگڑی لولی ہو جاؤ گی۔ ”ہونے دو۔“ اطمینان بھرا لہجہ تھا۔ پچاس روپے کے نوٹ کا نذرانہ ضرور چڑھایا کہ غربت دامن دل کو کھینچتی تھی۔

ہمارے ڈاکٹر فیضی نیچے کے اُن پڑھے لکھے لوگوں کی طرح ہی ہیں۔ جو کسی بھی مشکل میں ڈبہ پیروں جعلی عاملوں اور جادو ٹوٹنے والوں کے پاس بھاگے پھرتے ہیں۔ ”سب لفوا ہے چلو۔“

مگر مہر النساء ابھی پُر امید تھی۔ مزید کھوج کی طرف مائل تھی۔

پھر ایک درمیانی عمر کے آدمی نے انگشت شہادت سے اوپر سرسبز پہاڑوں کی چوٹی پر بنے گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بشقر پائین میں رہتی ہے گل پری عزیز خاں۔“

بشقر پائین اتنی بلند یوں پر۔ بشقر بالا تو پھر آسمان پر ہی ہوگا۔ میں سخت متعجب تھی۔

جب وہاں جانے کے لیے گاڑی والے سے بات کی تو معلوم ہوا کہ وادی گبور کا ایک

جوڑا بھی چھوٹے بچے کے ساتھ وہاں جانے کے لیے بیٹھا ہے۔

کیسی کٹھن چڑھائی تھی۔ راستہ سانپ کی طرح بل کھا کھا کر مڑتا تھا۔ دو گاڑیوں کا آمنے سامنے ٹکراؤ ہوا لگتا تھا اُسے راستہ دینے میں یہ تو لڑھک کر نیچے ہی گر جائے گی۔ قدرے ہمواری ایک جگہ پر گاڑی روک کر ڈرائیور نے کہا۔ اوپر پیدل جائیے۔ عمودی چڑھائی کے اس ٹیل صراط کو بھی پار کیا۔ چوٹی پر پہنچ کر جب ایک نظر نیچے ڈالی بخدا سورج کی چمکتی روشنی میں ہری کچور وادی سبز تلپنے کی طرح لشکارے مارتی تھی۔

ایسا فرحت آگئیں منظر تھا کہ جس نے دیر تک خود میں جذب رکھا۔ اس محویت کو جس لڑکی نے توڑا اسکی موٹی موٹی آنکھیں دنبالہ سرے سے بجی تھیں۔ فراخ پیشانی پر بالوں کی جھار لہریں کھاتی پھرتی تھی۔ انگریزی کی ٹانگیں توڑتی تھی پر اردو اچھا بول لیتی تھی۔ یہ اس ساحرہ کی بیٹی تھی جسے ملنے کے لیے ہم نے کوہ قاف کی چڑھائیاں چڑھی تھیں۔ لاہور یے جان کر میٹرک کی اس سٹوڈنٹ نے ہمیں خصوصی توجہ دی۔ جس کمرے میں بیٹھے وہ کار پیڈ تھا۔ اطراف میں مقامی رواج کے مطابق رنگین گدے بچھے تھے۔ پرچھتی رنگین دھاگوں سے کڑھے کپڑے سے بجی تھی۔ چھوٹی تپائی پر اگر بتی دان اور ماچس پڑی تھیں۔ ظاہرہ شواہد خاصے زبردست تھے اندر خانے کیا تھا اسکے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔

پھر ادھیڑ عمر کی ایک عورت بہترین لباس میں ملبوس اندر آئی۔ بڑا پکا پیٹھا چہرہ تھا۔ بڑی شاطر آنکھیں تھیں۔ تپائی پر بیٹھی۔ لڑکی نے ماں کے ساتھ نشست سنبھالی۔ ماچس کی تیلی جلی۔ اگر بتی اور لوہاں سٹلکے دھواں پھیلا۔ لڑکی نے مسئلہ پوچھا۔ میں نے پُرانا سوال دہرایا۔ ہم سے ہماری زبان میں بات کریں۔ آپکی زبان انہیں نہیں آتی۔ چلیے قصہ ختم۔ مگر سٹیج تو سیٹ ہو چکی تھی لہذا تماشا دیکھنے میں کیا حرج تھا۔ اب تالی بجی خاتون کا چہرہ بدلا آنکھیں ٹیڑھی میڑھی ہوئیں۔ مہر النساء، اپنا مسئلہ بتا رہی تھی۔ بازوؤں کا اوپر نیچے ہلا شروع ہوا۔ اس ہلا میں چند گول گول برے رنگ کے موٹے موٹے بیج گرے۔ بیٹی نے لپک کر اٹھائے۔ پھر میرا مسئلہ زیر سماعت آیا۔ ایسی مضحکہ خیز صورت پر جانے کتنے جتنوں سے ہنسی کو لگام ڈالی تھی۔ میری بار بھی ایسے ہی چند بیجوں

کا نزول ہوا۔ ایسا کرو اور ویسا کرو جیسے ہدایت نامے تھے۔

کمرے میں پُر اسراریت کے بھرپور رچاؤ کے باوجود برتن خالی ہے جیسے شور نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی صاحب نظر ہوتا تو ہم جیسی عورتوں کی چالاکیوں کو پل بھر میں جان کر آنکھوں کے ایک اشارے اور زبان کے دو بولوں سے ہمیں شرمندگی و خجالت کے پاتال میں دھکیل کر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے پر مجبور کر دیتا۔

باہر اگلے گھر کے سامنے لنڈے منڈے کشادہ سے چبوترے پر صنوبر کے درخت کی چھدری چھاؤں تلے بیٹھے ہوئے میں نے نیچے نگاہ کی۔ فطرت نے اپنی تخلیق کی دلداری کے لیے کیا کیا سامان پیدا کر رکھے ہیں۔ آنکھوں میں کھٹب جانے والا منظر۔ تھوڑی دیر بعد مہر النساء اور انکی بیٹی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

سورج کی اس ہمسائیگی کے باوجود یہ بشر پائین تو بشر بالاکہاں ہے؟ جیسے استفسار پر لڑکی کھڑی ہوئی خوبصورت ہاتھ سے اُس نے سامنے پہاڑوں کی عقبی سمت میں اوپر کی طرف رخ پھیر کر اشارہ کیا اور بولی۔

”بشر بالا ہے وہ۔ بہت بڑی آبادی ہے۔ لڑکیوں کا ہائی سکول بھی ہے ادھر۔“

خوبصورت لڑکی نے اپنی ماں کے پری خوان بننے کی جو کہانی سنائی وہ کچھ ایسی ہی ہے سرد پاتھی جیسی ہم اپنے علاقوں میں ان جعلی پیروں فقیروں کی سنتے ہیں۔

ریشن والی فیملی کی واپسی بھی ہمارے ساتھ ہی ہوئی۔ جہاں اترے وہاں اگلے کوئی ملنے والے بھی کھڑے تھے بڑی دہنگ قسم کی شخصیت تھی۔ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ناطے رشتے دار کے تولتے انہیں لینے ہی تھے۔ ساتھ ہی ہماری بھی کلاس لے ڈالی۔ ”بے وقوف عورتیں دکھتی ہیں آپ۔ پڑھی لکھی ہیں پر زری جاہل ہیں۔“ اجنبی جگہ پر کسی اجنبی انسان سے ایسے شاندار کلمات یقیناً آپکا سر گھمانے کے لئے کافی ہیں۔

ہونٹوں کی طرح ہم اُسے بٹربرد دیکھتے تھے۔

گاڑی والے پری خوان کے ساک سائیں ہیں۔ دیہاڑی دار ڈرائیوروں سے ذاتی  
گاڑیوں کے مالک بن گئے ہیں۔

ریشن والی فیملی بیچاری ماٹھی سی تھی۔ کرایوں بھاڑوں کے علاوہ دوسوکانڈرانہ پری خوان  
کے چرنوں میں چڑھا کر آئی تھی۔ ایسے میں بھلا اقبال کیوں نہ یاد آتے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی  
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن  
چلتے چلتے یہ بھی نصیحت ہوئی کہ خدا کس لیے ہے۔ اُسکے فرائض اوروں کو کیوں سوچتی  
ہیں۔

مہر النساء تو بازار میں داخل ہوتے ہی پتھروں میں الجھ گئی تھی پر میرا ذہن صرف اس  
ایک جملے میں گھنٹن گھیریاں کاٹ رہا تھا خدا کس لیے ہے۔  
واپسی کے لیے جو گاڑی بک کی وہ بڑی فضول نکلی۔ درشپ میں خراب ہوئی۔ ڈرائیور  
بڑا ایسا آدمی تھا۔ شرمندگی کا غازہ اس نے چہرے پر یوں ملا کہ ہمیں از خود کہنا پڑا۔ کوئی بات نہیں  
اسے ٹھیک کرو سامنے محل ہے وہ دیکھ لیتے ہیں۔

درشپ کا یہ محل بھی ٹوٹ پھوٹ کے راستے پر نکلا ہوا تھا۔ تنگ و تاریک کمروں کی  
سرنگوں سے گزر کر جب کشادہ آنگن میں آئے تو اس ویرانے میں ایک بوڑھے باپ اور بیٹے کو  
کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے دیکھا۔ ابھی تھوڑی سی گپ شپ ہی ہوئی تھی جب ملازم نے گاڑی  
ٹھیک ہونے کی اطلاع دی۔

رجی میں یہ پھر خراب ہوئی۔ بڑی خوفناک سی صورت حال تھی۔ ابھی صرف آٹھ بجے  
تھے پر ماحول پر چھائی گہری تاریکی۔ سیٹیاں بجاتی ہوا کے تیز جھکڑ۔ سناٹا اور چاروں طرف بکھری  
تنبہائی نے فضا کو حد درجہ دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ سڑک کنارے دھرے بڑے بڑے شہتروں پر ہم

بیٹھ تو گئے تھے کیونکہ کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا کہ دن بھر کی تھکن نے ٹانگوں کو ماش کے آنے کی طرح اکڑایا ہوا تھا۔ پر سچی بات ہے ٹک کر بیٹھنا بھی محال ہو رہا تھا کہ شہتروں کے درمیان فاصلوں میں ڈرتھا کہ کوئی سانپ بچھو نہ ہو۔

”اگر کوئی خدائی مدد شامل حال نہ ہوئی تو مجھے امید نہیں ہم صبح سے پہلے چترال پہنچ سکیں

گے۔“

مہر النساء سخت ڈپریشن میں تھی۔ خدا کو مہر النساء پر ترس آیا۔ اسکی کسی دعا کو فوری قبولیت حاصل ہوئی۔ بہر حال A.K.R.S.P والوں کی ایک گاڑی گزری جو ڈرائیور کے ہاتھ دینے پر رُک گئی۔

گاڑی کیا تھی کڑکار ڈھیارہ تھا۔ بگولے کی طرح اڑتی اس بلا نے معصوم سی ملی کی جان

لی۔

”ذرا آہستہ چلائیے“ کہنے کی کوشش کی پر وہاں کانوں میں روئی کے تو نے ٹھنسنے

تھے۔

ہم دونوں نے خوف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور آنکھوں کی زبان میں کہا۔

آج بچ گئے تو معجزہ ہی ہوگا۔

چترال پہنچ کر اور بستر پر لیٹ کر بھی ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ہم زندہ سلامت ہیں۔



## بھرموغلشٹ

اُس دن کی قطعی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ مہر النساء نے رات مجھے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ کل اُسے بازار جانا ہے ڈھیر ساری شاپنگ کرنی ہے۔ مقامی دستکاری کی اشیاء دیکھنی اور خریدنی ہیں۔ اور مجھے ایک دو دب اور کم گو خادم کی مانند اسی طرح اسکے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا جیسے وہ گزشتہ چند دنوں سے میرے ساتھ چلتی رہی تھی۔ اب اسکے اس نادر شاہی حکم پر آمنا و صدقا کہنے کے سوا میرے پاس چارہ کاری کیا تھا۔ یہ شاپنگ بھی کس قدر فضول اور بیہودہ کام ہے۔ میں قبر درویش برجان درویش جیسی صورت حال سے دوچار تھی۔ منہ پر خاموشی کا قفل لگائے مودبانہ انداز میں اسکے تعاقب میں تھی۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کی نجل خواری کے بعد اُس نے ہاتھ کھڑے کیے اور ہم پکوزے نان لینے کے لیے بازار کی واحد دوکان پر آکھڑے ہوئے۔ جب جیب میں بیٹھے اُس لڑکے نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔ ”گاڑی چاہیے کہیں جانا ہے۔“ میں نے لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ ہم شعور اس کے ساتھ گئے تھے۔

”کہاں جائیں“ اسوقت میں بھوک سے نڈھال پیٹ پوجا کی بھول بھلیوں میں اُبھی ہوئی اُسے دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

”بھرموغلشٹ۔“ بڑی خوبصورت قابل دید جگہ ہے۔ لڑکے نے مجھے راستہ دکھایا۔

مہر النساء سے بات کی اُس نے آمادگی کا توفی الفور اظہار کر دیا پر اپنے ساتھ خریداری کے ڈھیروں پلندوں کے بارے میں تفکر بھی اُسکے چہرے پر نمودار ہوا۔

”ارے قریب ہی تو ہمارا ہوٹل ہے۔ چیزیں اپنے کمرے میں سینت کر نکل چلتے ہیں۔“ نان اور پکوزوں کے رول بنائے۔ بوتلیں خریدیں اور شاداں و فرحاں گاڑی میں بیٹھے۔

یہ ایک ایسا سفر تھا جس کے راستے میں کائنات کی خوبصورت ترین تخلیق انسان کی بنائی ہوئی بستیاں نہیں تھیں فطرت کے جمالیاتی عکس درختوں پودوں اور پھولوں کی صورت میں کہیں نظر نہ آتے تھے۔ البتہ اس کا جلال بلند و بالا اور پھیلے ہوئے کوہساروں کی شکل میں ضرور خوف زدہ کرتا تھا۔ انکے سینوں پر بنے ہوئے چاقو کی تیز دھار جیسے راستے کو دیکھتے ہوئے انسان سوچے چلا جاتا ہے کہ وہاں تک پہنچے گا کیسے۔ اور جب وہ کہیں رُک کر پیچھے دیکھتا ہے تو کسی بل کھاتے خوفناک سانپ کی مانند راستے کو دیکھ کر بے اختیار خود سے کہتا ہے

”ارے میں ابھی اس راستے سے اوپر آیا ہوں۔“ ایسی ہی ایک جگہ پر رُک کر جب میں نے نظر بازی کی تو دو لوموچ کا قلعہ، دینین لٹ، دینین گول، چھاؤنی کا پل، چترال شاہی قلعہ، محل اور چترال اپنے سرسبز درختوں اور ٹین کی چھتوں والے گھروں کے ساتھ بہت خوبصورت نظر آئے تھے۔

اسی راستے پر گول نیشنل پارک جو تقریباً بیس ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے دیکھنے کو ملا۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ یہاں کون سے کون سے جانور ہیں ڈرائیور لڑکے نے سنولپر ڈ (برفانی شیر) ہمالیائی آئیکس۔ برفانی چیتے۔ مارخور۔ جنگلی بے۔ لومڑیاں اور اڑیاں کے متعلق تفصیلی بتایا۔ چترال سنولپر ڈ (برفانی شیر) کے سلسلے میں عالمی شہرت کا حامل ہے۔ خوبصورت پرندوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ ڈرائیور لڑکے کی یہ اطلاع خوش کن تھی۔

تقریباً ساڑھے نو ہزار فٹ کی بلندی پر پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی شاندار موٹل بنا رہی تھی۔ روزگار کے جھنجھٹوں سے اکتائے زندگی کے غیر ضروری اور اضافی تفکرات کے ستائے اور گونا گوں مصروفیات کے اثر دھام میں پھنسے ہوئے صاحب لوگ جب یہاں پہنچیں گے تو خود کو بلاشبہ ارضی جنت میں پائیں گے۔

ایک تو انسانی ہاتھوں اور دماغ کی کارگیری دوسرے فطرت کی خوبصورتی نے ماحول کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چترال کسی سرسبز قالین کی طرح قدموں تلے بچھا نظر آتا تھا۔ نیلا آسمان میٹھی میٹھی مہربان دھوپ کے ساتھ سائباں کی طرح تنا ہوا تھا۔ اترائی کی جانب کے گھنے جنگلوں سے آتی چلغوزے اور صنوبر کے درختوں کی ملی جلی خوشبو میں حیات کو نئی لہافتوں سے آشنا کرتی تھیں۔

پانچ سے دس ہزار فٹ کی بلندی تک تقریباً چودہ پندرہ میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے چلغوزے کے درخت چراگا ہیں مہتر چترال اور پبلک کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ گول نیشنل پارک کا جھگڑا چترال کے سابقہ حکمرانوں اور حکومت کے درمیان عدالتوں میں زیر بحث ہے۔ پھر گاڑی میں بیٹھے اور اوپر محل میں پہنچے۔ ماضی کی پرشکوہ عمارات کو کھنڈروں میں تبدیل ہوتے دیکھ کر دل پر گھونسا سا پڑا۔ شہ نشینوں، غلام گردشوں اور محرابوں والے اس ٹوٹے پھوٹے محل میں افسردگی سے گھومتے پھرتے یہی سوچتی رہی اور بار بار اس کا مہر النساء سے اظہار کرتی رہی کہ وہ جو ڈھیروں پیسہ خرچ کر کے سیر سپاٹے کے لیے آئیں گے ان کھنڈروں کو دیکھ کر کتنے مایوس ہوں گے۔

ہر جگہ ہسوک کی جھاڑیوں کا راج تھا۔ مکئی کی فصل پر شاب تھا۔ خوبانی موٹی مگر کچی تھی اور اخروٹ کے درخت تلے بزرہ تھا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ سامنے پہاڑ تھے۔ کوئی کاری کا پہاڑ تھا تو کوئی دینین کا۔ داہنے ہاتھ آلو کا کھیت تھا۔ جی چاہا آلوؤں کا بورا بھر کے لے جاؤں۔ پیچھے کہیں چشمہ تھا اور نشیب میں جنگل۔ اسے دیکھنے چلے۔ چشمہ کیا تھا جیسے چھوٹی سی کھال ہو۔ ہاں البتہ چلغوزے کے درختوں کا گھنا جنگل تھا جو نیچے اترتے اترتے کسی اندھے کنوئیں میں بدل جاتا تھا۔ تھوڑی سی اترائی کے بعد احساس ہوا کہ نیچے تک پہنچنے اور واپس اوپر آنے کے لیے ہم جیسوں کو پورا دن درکار ہوگا۔ اوپر سے ڈرائیو شور مچائے جاتا تھا۔ دفع کریں جی یہ چڑھائی اترائی آپ کے بس کی بات نہیں۔

اس مہم جوئی کو ادھر وہاں ہی چھوڑ کر اوپر آئے تو دیکھا کہ یہاں وہاں برسات میں اُگنے

والی کھسیوں کی طرح خوبصورت چہروں والی عورتیں اور لڑکیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے شوخ رنگین آنچل اور رنگارنگ ملبوسات نے جیسے اس شفاف نکھرے اور ڈھلے ہوئے ماحول میں دھنک رنگ اتار دیئے تھے۔ یہ A.K.R.S.P کے شعبہ خواتین کا ایگریکلچرل ونگ تھا جو پکنک منانے یہاں آیا تھا ان سے خوب گپ شپ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ شعبہ عورتوں کو چھوٹے پیمانے پر سبزیاں اگانے اور مارکیٹنگ کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔ A.K.R.S.P بڑی فعال اور مستعد تنظیم ہے جو شمالی علاقہ جات کی تعمیر و ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔

## بریر۔ پوڑ میلہ۔ ڈین بزکشی اور بودلک

چترال سے یہ میری تیسری ملاقات تھی۔ پوڑ (ستمبر کے آخر میں بالائی چراگا ہوں سے مال مویشیوں کا نیچے وادی میں آنے اور اخروٹ و انگور پکنے کی خوشی میں منایا جانے والا تہوار) دیکھنے کی حسرت بھی اندر سے نکل کر آنکھوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ تاج محمد فگار صاحب سے جو چترال کی بڑی علمی ادبی اور سماجی شخصیت ہیں فون پر رابطہ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اس تہوار کے لیے تاریخ کے تعین کا جان کر مجھے مطلع کریں گے۔ میری میری بہن کوثر جمال اس بار میری ساتھی تھی۔ وہ یقیناً اپنے بچپن کے نو کرطیاروں میں جیالے پائلٹوں کے سنگ کیے گئے سفروں کے کسی ایسے عکس کو جو ابھی بھی اسکی ذہنی دیواروں سے چمٹا ہوا تھا کودیکھنے کے لیے چترال جانے کی آرزو مند تھی۔

ستمبر کے اوائل کی اس گرم دوپہر میں تاج محمد فگار صاحب کی چترال سے آنے والی آواز نے مجھے پندرہ ستمبر کو پوڑ کے میلے کی خبر سنائی۔

سفر دونوں ہی بڑے مزے کے تھے۔ زمین کے سینے پر گڑگڑاتی سیٹیاں بجاتی اور چھک چھک کرتی نے جیسے طوالت کو بھی عین راحت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور ہواؤں سے گتھم گتھا ہونے والے نے تو پل جھپکتے میں جیسے عرش سے اٹھا کر فرش پر مارا تھا۔

ویننگ اوئنج کے شیشوں والے دروازوں کے پیچھے تاج محمد فگار کا محبت بھرا چہرہ جھانکتا

تھا۔ اس چہرے سے بالمشافہ نکر اوپر سفر کے خیریت سے کٹنے جیسے اطمینان بھرے اظہار یہ کے بعد گھر کے لیے اصرار تھا جب کہ میری ہوٹل کے لیے نکرار تھی۔ پر جب انہوں نے کہا۔  
 ”یہ کیسے ممکن ہے آپ اپنے بھائی کے شہر میں ہوں اور ہوٹل میں ٹھہریں۔“  
 تو سامان اٹھا کر اُنکے پیچھے چلنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

زر زرانہ گاؤں میں نالے کے قریب گھنے درختوں کے جھنڈوں میں وہ گھر تھا جس کا وسیع ڈرائنگ روم صوفوں اور قالینوں سے اور بلحقہ گیٹ روم آرام و استراحت کے ضروری لوازمات سے سجا تھا۔ مسز تاج بڑی بزد بار کم گو اور متین سی خاتون تھیں۔ چترال شہر کی لیڈی کونسلر بھی تھیں اور سیاسی سوجہ بوجہ کی مالک بھی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بانی پٹنٹس (چترالی نشست گاہ) میں جانا تھا۔ عقیبی گھر میں چنار کے بے حد قدیمی درخت کی شاخوں کو تیز ہواؤں میں جھولتے اتار کے سرخ پھل کو ٹہنوں پر جھومتے اور سیبوں کو بل کھاتے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے کمرے کی پور پور میں صدیوں پرانی کہنہ سالی رچی ہوئی تھی۔ دھواں خوردہ چھت یوں چمکتی تھی جیسے اس پر ابھی تازہ سیاہ پینٹ کیا ہو۔ چوٹی کڑھائی دار ستون تاج صاحب کے دادا پر دادا کے زمانوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ چوٹی تختوں سے حد بندی کیا ہوا وسطی حصہ جس پر بچھے دسترخوان پر اعلیٰ درجے کی کراکری بھی تھی اور تاج صاحب کی چوتھے نمبر والی خوبصورت بیٹی اپنی دلنشین سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں سروس دیتی تھی۔

چترال کے میٹھے اور صحت بخش پانیوں کی پیدا کردہ اور مسز تاج کے سلیقہ مند ہاتھوں کی تیار کردہ بھنڈی حد درجہ ذائقہ دار تھی کہ نصف لمبو ترہ نان تو صرف اسی ذائقہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ اور جب افراد خانہ کے بارے میں غائبانہ تعارف ہوتا تھا میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تاج صاحب آپ تو بادشاہ ہیں۔“

چشمہ پہنے اس چہرے پر ناقابل فہم سے تاثرات ابھرے جنہیں محسوس کرتے ہوئے

میں بولی۔

”دراصل ہماری ہر لوک کہانی کا بادشاہ یا سات بیٹیوں کا باپ ہوتا ہے یا پھر بے اولاد۔

آپ کی بھی سات بیٹیاں ہیں لہذا آپ بھی بادشاہ ہوئے نا۔“

بڑا بھرپور اور جاندار قہقہہ تھا۔ جو انکی بیگم بیٹی اور خود انکے اپنے اندر سے نکلا تھا اور جس

نے ماحول کو پھلجڑی سا بنا دیا تھا۔

ہمیں آرام کرنے کا کہتے ہوئے وہ پرنس اسد الرحمن سے قلعہ دیکھنے کی اجازت لینے

چلے گئے۔

چترال کا موسم ابھی گرم تھا۔ میں لیٹی ضرور پر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ کوثر ابھی جاگن

مینی میں تھی۔ اُسے سُناتے ہوئے کہ میں ذرا پتہ تو کر آؤں پوڑ کس وادی میں ہو رہا ہے۔ کب اور

کیسے جانا ہے کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

تاج صاحب کے گھر کی بلند و بالا سیڑھیاں اتر کر نشیب میں واقع کریانہ کی دوکان پر

آئی تو تھوڑی سی رہنمائی وہیں سے مل گئی۔ نالے کے ساتھ ساتھ چڑھائی چڑھتا راستہ سیدھا

اتالیق بازار میں نکلتا ہے وہیں کالاشیوں کا مرکز ہوٹل ہے۔

پر جب کالاشیوں کے اس مرکز میں پہنچی تو وہاں اماں نہ پونیاں والی بات تھی۔ بہرام

شاہ اور چند دیگر کالاشیوں سے ملاقات ہوئی۔ پر پوڑ کے بارے میں تقریباً سبھی لاعلم۔ پوڑ تو یوں

بھی بریر وادی کا تہوار ہے کہ انگور کی پیداوار سنوں کے حساب سے وہیں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا

تھا۔

میرادل اپنا آپ پیٹ لینے کو چاہا۔ بہرام شاہ نے وہیں گھاس پر مجھے بٹھاتے ہوئے

چائے کا آرڈر دیا۔ چائے کے کپ میں چینی نہیں زہر گھلا ہوا تھا جس کا ہر جرہ حلق سے اترتے ہی

مجھے چیرتا چلا جا رہا تھا۔ تاج صاحب نے ہمیں کیسے بلالیا۔ انہیں کس نے پندرہ سولہ کا کہا تھا۔ میں

خود سے اُلجھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھتی تھی۔

واپس آ کر جب تاج صاحب پر سردی گرمی جھاڑی تو انکی شان استغناد دیکھنے کے قابل

تھی۔ آدھا نزلہ آ یوں چیک پوسٹ والوں پر اور آدھا ہمارے اوپر گراتے ہوئے گویا ہوئے۔  
 ”ہمیں تو سمجھ نہیں آتی کہ آخر آپ نیچے والے لوگوں کی مت کیوں ماری ہوئی ہے؟  
 بھاگے چلے آتے ہیں۔ بے کیا ان کے تہواروں میں ڈھول کی ڈھما ڈھم اور آگے پیچھے کی چلت  
 پھرت۔“

گرمی سے بھری ہوئی سہ پہر میں نے مرحوم راجہ کرنل مطاع الملک کے سوگوار خاندان  
 کے ساتھ افسوس میں گزاری۔ سال بھر گزر جانے کے باوجود انکی بڑی بہو کے آنسو انکی یاد میں ابھی  
 بھی روانی سے بہتے تھے۔

باہر تارکی تھی ہواؤں کے جھکڑ تھے۔ دریائے چترال کے پار پہاڑوں پر گھروں میں  
 روشن بجلی کے قمقمے جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے اس ڈر کو کچھ کم کرتے تھے جو پرانے گھر جاتے ہوئے  
 میرے اوپر طاری تھا۔

سج سج قدم اٹھاتی اونچی نیچی جگہوں پر کمال احتیاط سے پاؤں دھرتی میں عقبی آنگن  
 میں نمودار ہوئی۔ جہاں تاج صاحب کرسی پر فکر مند بیٹھے میرے ابھی تک گھر نہ پہنچنے پر کوثر سے اپنی  
 پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔

کمال ہے تاج صاحب یہ چترال ہے چترال۔ اکیلی عورت کو یہاں کیا خطرہ ہے۔  
 رات کے کھانے پر فیملی کے بقیہ افراد بھی موجود تھے۔ نویں کلاس میں پڑھنے والی ان  
 کی گول منول سی پرکشش بیٹی حنا اور سوئیٹی۔ فہد احمد انکا بیٹا جو اکلوتا ہونے کے باوجود حد درجہ مودب  
 اور بیباک تھا۔

چاولوں کا خشکہ مرغی کا شور بہ اور نان کے ساتھ پشور برٹھ خاص چترالی ڈش موجود تھی۔  
 پیاز اخروٹ قیمے آٹے اور ہری مرچ پودینے دھنیے کے ساتھ تیار کردہ یہ آٹم بے حد ذائقہ دار تھا۔  
 ہم نے تو اسے ہی رغبت سے کھایا۔ گھر کے درختوں سے اترے سیبوں کے بعد قبوہ پیتے ہوئے  
 تاج صاحب کو سنا جنہوں نے کل دس بجے شاہی قلعہ اور محل دیکھنے کا بتایا۔

یہاں برق گرانے والی ایک اور خبر تھی کہ ”شاہی محل کی وہ مہ لقا جسے دیکھنے کی میں آس لیے پھرتی تھی عرصہ سات سال سے زمین کا رزق ہو چکی تھی۔“  
 مسز تاج کے یہ الفاظ آتش شوق پر تیل اور تیلی گرانے کے مترادف تھے۔  
 چترال میں اس جیسی حسین اور طر حدار عورت کب دیکھنے میں ملے گی۔ اُسے تو گھنٹوں دیکھو اور جی نہ بھرے والی بات تھی۔

اس ڈپریشن کو کم کرنے میں بیچارے قہوے کی شامت جو آئی سو آئی تاج صاحب سے بھی اُلجھ پڑی جو بڑی معصومیت سے پرنس اسد کے اس استفسار کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھے کہ ”آخر انہوں نے آپ کی عمر کے بارے میں کیوں پوچھا۔ کہ آپ اُن سے بڑی ہیں یا چھوٹی۔“  
 ”تاج صاحب آپ تو بھولے بادشاہ ہیں۔ انکے گہرے تفکر پر میری ہنسی چھوٹ گئی تھی کم عمری کی صورت میرے ساتھ بات چیت کو وہ انجوائے کریں گے۔ انکا وقت اچھا گزرے گا۔ دوسری صورت میں مجھے نر خایا جاسکتا ہے۔ ان کے لیے یہ وقت کا ضیاع ہے۔“  
 ”نہیں نہیں آپ بالکل غلط سمجھیں۔ ہمارا پرنس اس مزاج کا نہیں۔“

”آپ واقعی بہت سیدھے اور بھولے ہیں۔“ میں نے کوثر کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔  
 اس روشن صبح بالکونیوں کی بیرونی دیواروں پر ٹنگے مار خوروں اور ہمالیائی آئیکس کے سر پرانی زنگ آلود تلواریں تو ہیں اور جنگلی آلات حرب ایک عہد کی داستان سناتے تھے۔

اندر منقش دیواروں پر کٹور خاندان کے شہزادے راجے مہاراجے ہیروں کے تاجوں سے بچی پیشانیوں کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے تک پھیلے ہوئے تاریخ کی کتابوں کے اوراق اُلٹاتے تھے۔ ان ورقوں میں رئیسہ خاندان کی شکست اور تیمور لنگ کی اس اولاد کے کارنامے رقم تھے۔ امان الملک سے لے کر موجودہ سیف الملک ناصر تک۔ موجودہ شہزادہ تو یوسف ثانی تھا۔

ریاست کے مدغم ہونے کے بعد سے اسلام آباد میں مقیم تھا۔ اسکی جھیل جیسی نیلی آنکھیں اور تابناک چہرہ دیکھتے ہوئے میں سوچتی تھی۔ اسلام آباد کی فیشن اہل عورتیں تو اُسے

دیکھ کر اپنے کلبجوں پر ہی ہاتھ دھرتی ہوں گی۔ نشست گاہوں میں بچھے قالین صوفے ہاتھی دانت کی انٹیک میزیں اور تپائیاں۔ ماضی کی عہد ساز شخصیات کی تصویروں سے بچی دیواریں۔ گچ کی ان دیواروں میں دراڑیں تھیں۔ چیزوں پر پرانے پن اور بوسیدگی کی چھاپ تھی پر پھر بھی ان پر پھیلا شاہانہ رعب داب اور شان و شوکت کا پرتو متاثر کرتا تھا۔ محل بھی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار تھا۔ ایک ایک کمرہ نادر چیزوں سے آراستہ ضرور تھا نیل گائے مارخور اور چیتے کے سینگوں سے بچی غلام گردشیں تھیں جہاں گھومتے ہوئے بندہ عروج و زوال کے المناک تصورات کے زیر اثر ہول کھائے چلا جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان محل بازیوں میں رہنے والے لوگ کہاں گئے۔ اب یہ ڈھنڈار سے کمرے عبرت کا سامان بنے پڑے ہیں۔

میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ اونچی اونچی فصیلوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہاں قید ہو گئے ہوں۔ باہر نکل آئے۔

بلند و بالا فصیلوں سے باہر راجہ فیملی کے باغ باغیچوں کے ساتھ بنی سڑک پر جس کے بائیں ہاتھ نشیب میں پامیران کے ہوٹل کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے چلتے ہوئے ہم پرنس اسد الرحمن سے ملنے جا رہے تھے۔

دریائے چترال کے پہلو میں یہ ایک جدید وضع کا خوبصورت گھر تھا۔ ابھی ناشتے کا مرحلہ جاری تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ ہنسے اور بولے۔

آئیے باتیں کرتے ہیں۔ جو آپکو اپنے مطلب اور کام کی چیز محسوس ہو اُسے رکھ لیں باقی کو دفع کر دیں۔

اب ان کے اور حکومت کے درمیان پیدا شدہ جائیداد سے متعلق مختلف معاملات جو عدالتوں میں زیر سماعت تھے دفع کرنے کے قابل ہی تو تھے۔

ڈیزہ گھنٹے کی اس نشست میں جن حقائق کو میں جاننے کی آرزو مند تھی ان میں سے کوئی بھی موزوں انداز میں زیر بحث نہیں آیا۔ اور اگر کوئی آیا تو وہ قانونی مویشگانوں کی بھول

بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔ ریاست کے پاکستان میں مدغم ہونے کی تاریخ بھی اُن حقائق سے لگانہ نہیں کھاتی تھی جو میں نے سرکردہ لوگوں سے سنے تھے۔ خاندانی الہم دیکھنے کا معاملہ پھر کسی اور وقت پر اٹھ گیا۔ سیف الرحمن کی بیوہ سے شادی کرنے میں اُس کے بے پایاں حُسن کی کوئی کرشمہ سازی تھی یا ماں بہنوں کا دباؤ تھا کہ اس کی اتنی نوعمری کی بیوگی پر خواص چھوڑ عوام بھی اشک کناں تھے۔

سچی بات ہے جب میں اٹھی تھی میرے دماغ میں کھولن تھی۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ سب کچھ گنڈا ہو گیا تھا۔ اور میں سخت ڈپریشن میں تھی۔ یہ بھی کیسا عجیب اتفاق تھا کہ شاہی قلعے کی فصیل کے پاس سفید ٹیوٹا میں ایک معزز مرد نے ہمیں قریب پہنچنے پر فراخ دلانہ پیشکش کرتے ہوئے کہا تھا۔

آہمبوریت جانا چاہتی ہیں؟

پل بھر کے لیے ہم حیرت زدہ سے ہوئے۔ پر حیرت جلد ہی رفع ہو گئی کہ صاحب کسی سگریٹ کمپنی کی طرف سے ایڈورٹائزنگ کے سلسلے میں چترال آئے تھے۔ ہمشیرہ ساتھ تھیں ان کے پاس خود وقت نہیں تھا۔ ڈرائیور ہمشیرہ کو بمبوریت لے جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے بہن کی دوسرا تھ کے لیے پیشکش کر دی۔

میں نے تو پل نہیں لگایا۔ ہنستے ہوئے یہ کہتے ہوئے ”ارے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔“ گاڑی میں گلہری کی طرح پھدک کر بیٹھ گئی۔

پرشیشیوں میں سے میں نے دیکھا تاج صاحب حواس باختہ سے گم نم پریشان کھڑے تھے غالباً سمجھ نہیں پارے تھے کہ اس عورت کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یقیناً اگر کہیں اس وقت میری ماں موجود ہوتی تو تاج صاحب کے شانے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔ چھڈ پٹر۔ یہ تو ہے ہی سارے زمانے کی ادا گون اسکا تو وہ حال ہے۔ جنے لایا گلیں اودے نال اٹھ چلی۔

جب گاڑی چلی میں نے بیک سے لسٹ کا ڈبہ نکالا۔ خود لیا۔ کوٹر کو دیا۔ مسز ہرہ ممتاز کو

چاہت کے ساتھ پیش کیا۔ ڈرائیور کو بھی اس منہ ماری میں شامل کیا۔

چلو بمبوریت میں پوڑ کا کچھ پتہ تو چلے گا۔ میں نے طمانیت سے سوچا۔

پر جو نہی جیپ نے آیون کے لیے عمودی اترائی پر قدم دھرا میرے ذہن نے فلا بازی

کھائی۔

بمبوریت کی بجائے بریر جایا جائے۔

اس خیال نے گاڑی کی رفتار پکڑنے کے ساتھ ساتھ زور پکڑایوں کہ میں نے اپنا ہاتھ

مسز زہرہ ممتاز کے بھاری بھر کم شانے پر رکھتے ہوئے انہیں بریر وادی کے دلفریب نظاروں کی ایسی

دل کش تصویر دکھائی کہ وہ بے اختیار بول اٹھیں کہ مجھے تو سیر سے غرض ہے۔ ڈرائیور نے ذرا

سی پس و پیش کی تو میں نے وہاں کے نسوانی حسن کے یوں قصیدے پڑھے کہ بیچارے کو یقیناً دل پر

ہی ہاتھ رکھنا پڑا ہوگا۔

فیصلہ ہوا کہ آیون سے ہی بریر جایا جائے۔ میری باچھیں دور دریا کو کسی کشادہ دل رئیس

کی طرح سبک خرامی سے بہتے دیکھ کر کھلی جاتی تھیں۔

سڑک گو کسی کنجوس کے دل کی طرح تنگ اور کسی غریب کی طرح بے مایہ سی تھی مگر نہی

نہیں لگ رہی تھی کہ بریر کو جاتی تھی۔ پہاڑوں کی اونچائی کسی اعلیٰ ظرف کی طرح بلند تھی۔ سڑک

کے کچا ہونے کی وجہ سے ہچکولے جھولے جھلاتے تھے۔ راستے نے ایک جگہ آ کر ایسی دل دہلانے

والی صورت بنا رکھی تھی کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زہرہ ممتاز اسکی خوفناکی سے لرز کر چیخ اٹھیں۔ ڈرائیور

مخاطب تھا اور جو صلے والا بھی۔ فوراً بول اٹھا تھا۔

مت گھبرائیے۔ ابھی گاڑی یہاں سے نکل آئے گی۔

گہریت پر بریر وادی سے آتا ہوا نالہ دریائے چترال میں گر رہا تھا۔ گہریت پشاو روڈ

پر وہ جگہ ہے جہاں سے بریر کو راستہ جاتا ہے۔ اسے بریر موڑ بھی کہتے ہیں ڈرائیور ہمیں پہلے گہریت

موڑ پر لے آیا تھا اسے گاڑی کو چیک کرنا تھا۔ ہم آبادی کے لوگوں سے پوڑ کے بارے میں پوچھنے

گئے۔ جب پھل پک کر گرے گا تب قاضی گنڈولک سر کردہ لوگوں کے صلاح مشورے سے تاریخ کا اعلان کرتا ہے۔ بالعموم ستمبر کا آخری ہفتہ ہوتا ہے۔ مایوسی تو پہلے ہی تھی یہ سب سن کر آہ بھری اور گاڑی میں بیٹھے۔ پل کر اس کیا اور سفر پھر دریا اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ شروع ہو گیا۔ بریر کا راستہ بہت خطرناک تھا دریا اور سڑک کے دونوں جانب پہاڑوں کی تنگی نظر کو عجیب سی کوفت کا احساس دیتی تھی۔ چشموں سے جگہ جگہ راستے کا کناؤ ہوتا تھا۔

یہ بیزار کن صورت عین راحت میں بدلی جب بریر کا آغاز ہوا۔ یوں لگا جیسے بہشت بریں میں داخل ہو گئے ہوں۔

ہر سو سبزہ تھا۔ پکے ہوئے سیاہی مائل عنابی کالے سفید اور سرخی مائل انگوروں کے لٹکتے چھچھے مکئی کے سر سبز کھیت پھلدار درخت اور جنت کی حوروں جیسے چہروں والی لڑکیاں اور عورتیں کہیں کھیتوں میں کہیں بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتی نظر آئیں۔

بریر نسا بڑا بھرا پڑا سا گاؤں تھا۔ ریٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے قبرستان تھا۔ کس قدر عبرتناک نظارہ تھا۔ تابوت کھلے پڑے تھے بکھری ہوئی ہڈیاں چیخ چیخ کر متکبر بندے کو اپنی اوقات کا پتہ بتا رہی تھیں۔

اس وقت دو بج رہے تھے اور بھوک سے برا حال تھا۔ چنانچہ ایک سڑک کے کنارے ٹہری واسے ہوٹل سے روٹی کھائی۔

اب گھروں پر پھیلی بیلوں پر منوں کے حساب سے لٹکتے انگور کے خوشوں کو دیکھ کر آنکھوں میں تھیر شوق اور انہیں توڑ کر کھانے کی ترغیب جاگی۔ پر جو نہی ایک بھری پڑی بیل کو ہاتھ لگا یا وہ ہا ہا کار مچی کہ یوں محسوس ہوا جیسے غلطی سے ہاتھ کسی بھڑوں کے چھتے میں پڑ گیا ہے۔

میرے ازد گرد لوگ کھڑے تھے جو میرے ہاتھوں کو دیکھتے تھے کہ ان میں کوئی انگور کا

خوشہ تو نہیں۔

کوثر اور زہرہ ممتاز دور کھڑی پریشانی سے دیکھتی تھیں کہ ہوا کیا ہے۔

۱۱ اگست سے ۲۰ ستمبر تک پھلوں پر DANE کا قانون لاگو ہے پھل کو کوئی توڑ نہیں  
سکتا ہے۔ اگر کوئی قانون شکنی کرتا ہے اسے جرمانہ ہوگا۔ ایک جو شیلے لڑکے نے با آواز بلند گویا اس  
قانون کی منادی کی۔

کوثر قریب آچکی تھی اور یہ سب سن کر اونچی اور غصیلی آواز میں بولی تھی۔

”کچھ خدا کا خوف کرو۔ تمہارا پوڑ دیکھنے کے لیے ہم اتنی دور سے پینڈے مارتے  
آئے ہیں۔ ذرا ہماری آنکھوں میں تو جھانکو جو تمہاری اس زمین پر پھلوں پھولوں اور فطرت کے  
حسن و خوبی کو قدرت کی تم پر فیاضیوں پر رشک و حسد کے جذبات اُگل رہی ہیں۔ ہم مہمان ہیں  
تمہارے۔ کیا تمہیں مہمانداری کا ذرا بھی احساس نہیں۔ تمہارے کنویں سے کوئی پیاسا پانی نہ  
پئے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“

کوثر کی جذباتی باتوں کا اُن پر خفیف سا اثر بھی دیکھنے کو نہ ملا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ  
ہمیں اخروٹ کے درخت تلے آئے اور اُس نوجوان لڑکے جس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور  
جس کا نام شاہ حسین تھا ہمیں بتانا شروع کیا۔

دراصل پندرہ اگست کی صبح سب کالاشی مرد اپنی چراگاہوں اور وادی سے دُور مویشی  
خانوں سے پنیر کیلاڑ اور دودھ لے کر آتے ہیں۔ خواتین خانہ کی پکائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ عصر  
کے وقت مالوش (قربانی کا دیوتا) پر جا کر وہاں اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھانے کے بعد مالوش کے  
سامنے باادب کھڑے ہو کر اپنی سلامتی اولاد کی درازی عمر پھلوں کی آرضی و سماوی آفات سے بچاؤ  
اور قربانی کی قبولیت کی دعا مانگتے ہوئے پھلوں کی ایک ماہ کے لیے حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ ڈین  
ہمارا مذہبی وعدہ ہے جسے توڑنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ چلیے آپ کو ہم اپنے مرکزی گاؤں گورولیکر  
چلتے ہیں ہمارے مذہبی رہنما شیر بیگ سے آپکو بہت سی باتوں کا پتہ چلے گا۔ شاہ حسین نے پیشکش  
کی۔ یہ امر بھی باعث صد اطمینان تھا کہ زہرہ ممتاز اس سیر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

”ضرور۔ دیکھیں تو سہی وہ کیا سنا تے ہیں۔“

سچی بات ہے ہماری آنکھیں تھک گئی تھیں پر ریلے انگوروں سے لدی بیلوں کا سلسلہ  
لامتناہی تھا۔ اخروٹ کے بلند و بالا درختوں اور خُسن و جوانی سے بھر پور لڑکیوں کے نظاروں نے  
وادی کی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

گور و مرکزی وادی ہے۔ شاہ حسین نے ایک جگہ گاڑی رکوائی اُترا۔ اوپر گیا اور تھوڑی  
دیر بعد ایک ہنستے مسکراتے آدمی کے ساتھ ظاہر ہوا جس نے ہمیں بریر میں خوش آمدید کہتے ہوئے  
اندر چلنے کی دعوت دی۔ گھر تو ایک ہی جیسے نمونے کے تھے۔ شیر بیگ بڑی میٹھی طبیعت کا بندہ تھا۔  
محبت پور پور سے نپک رہی تھی۔

ہمارا پوڑ دیکھنے کے لیے آنا اسکے لیے باعث مسرت تھا پر غلطی سے قبل از وقت آمد پر  
متاسف بھی تھا۔ ”آپ کے اس ڈین نے تو ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔“ کوثر بے  
صبروں کی طرح بولی۔

ذین کا مقصد دراصل کالا ش قوم کو ضبط نفس کی تعلیم دینا ہے۔ بالعموم اس کا دورانیہ ڈیڑھ  
ماہ کا عرصہ ہے یعنی ۱۱ اگست سے ۲۹ ستمبر تک۔ بزکشی کی ادائیگی گویا اس قانون کے خاتمے کا اعلان  
ہے۔ اس رسم کے بعد ایک دن کے وقفے سے پوڑ کا میلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اب ہم سب کے چہروں پر بزکشی سے متعلق سوال رقم تھا۔ جسے انہوں نے پڑھا پر انکے  
بولنے سے پہلے چائے آگئی تھی۔ چائے کے ساتھ جو لوازمات آئے تھے ان میں بھننے ہوئے مکئی  
کے سفید بھٹے مغز اخروٹ خشک خوبانی اور بسکٹ۔

میں نے مکئی کا آدھا بھٹ اٹھایا اُسے چھوٹی سی چکی ماری تو صاحب خانہ نے ساتھ ہی  
مغز اخروٹ والی پلیٹ آگے کرتے ہوئے کہا۔

”بھٹے اس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔“

”بہت خوب۔“ اس نئے آمیزے کو شوق سے کھاتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔

”وادی کی مکئی ابھی کچی ہے کل میں چترال سے یہ لایا تھا۔ اخروٹ بھی پارسال کا

ہے۔ نیا تو ابھی درختوں پر ہے۔“

چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کپڑے میں رکھتے ہوئے انہوں نے بات جاری رکھی۔ بزکشی کی رسم کے لیے عصر کا وقت بکری کے دو بچے وادی کے سرکردہ معزز لوگ ایک نابالغ بچہ جس نے نہانے کے بعد نئے کپڑے سر میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگایا ہو ضروری ہیں۔ یہ لوگ ہمارے سب سے طاقتور دیوتا مہاندیو جو وادی سے بہت دور چنار کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی دیوار پر موجود ہوتا ہے کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔

بکری کے پہلے بچے کو نابالغ بچہ بغیر کسی مدد کے خود زنج کرتا ہے۔ کلباڑی سے کھال اتارے بغیر اُسکے نکلنے کرتا ہے۔ مہاندیو پر اُسکے خون کے چھینٹے پھینکتا ہے اپنے سر پر بھی ملتا ہے۔ دوسرے بچے کے ساتھ وہی عمل پھر دہراتا ہے۔ اُسے بھی نکلڑوں میں کانتا ہے۔

معززین میں سے ایک آدمی اسکی طرف خشک لکڑی کی ٹہنیاں پھینکتا ہے جنہیں جلا کر بچہ اس پر گوشت بھون کر خود کھاتا ہے۔

اپنے لیے معززین کا علیحدہ گوشت بھوننا اُسے کھانا اور پھر انگوروں سے منہ میٹھا کرنا ضروری ہے۔ دو دن بعد وادی میں میوہ اُتارو کی رسم شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا آپ پندرہ دن ٹھہر جائیں۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ یقین جانئے۔ پوڑ والے دن اس تنگ سی وادی میں حسن و رنگوں کی پچکاریاں یوں چھٹی ہیں کہ وادی اور اس پر تنا آسمان بھی لال گلال نظر آتے ہیں۔

باہر کی وادیوں کے لوگوں سیاحوں گاڑیوں کی بھرمار اس زمین کے چپے چپے پر زندگی کو قہقہے لگاتے شور مچاتے اور تاپتے گاتے دیکھتی ہے۔ بڑی بڑی چوبلی ٹوکریوں میں میٹھا سیلا تازہ جنت کا پھل ٹنوں کے حساب سے اُترتا ہے اور منوں کی مقدار میں مفت بانٹا جاتا ہے۔

”پھل کی اتنی بہتات تو یقیناً وادی کے لیے کاروباری نگاہ سے بہت منافع بخش ہو

گی۔“

زہرہ ممتاز کا یہ سوال کچھ ایسا بھی نہ تھا کہ شیر بیگ اس پر اپنی ہنسی ہی نہ روک پاتے۔ وہ بنے چلے جا رہے تھے۔ شاہ حسین مسکرائے چلا جا رہا تھا اور ہم تھے کہ ہونقوں کی طرح انکی صورتیں دیکھے چلے جاتے تھے۔

ایک دانہ نہیں بیچتے۔ ان ریلے مینھے انگوروں سے شراب بنتی ہے۔ نہایت بڑھیا ذائقہ دار اور غوانی رنگت والی شراب جو گندم کے گیلے آٹے میں مغز اخروٹ اور نمک گھی کی آمیزش سے بننے والی روٹی کے ساتھ ہمیں دسمبر جنوری کے تاحہ نظر پھیلے برف کے صحراؤں میں برچھی کی طرح کانٹے والی تن بستہ ہواؤں میں زندہ رکھتی ہے۔ ہمارا دسمبر کا چاؤ موس کا تہوار بھی اسکے بغیر ادھورا ہے۔

آپ کی چترال میں آنے والی حکمران اور ایلٹ اس شراب کے لیے مری جاتی ہے۔ معلومات فراہم کی جا رہی تھیں دو نوٹرڈل کلاس عورتیں شراب کے اس درجہ پسندیدہ ذکر پر چسپیں بچیں تھیں۔ ان کی پیشانیوں کی لکیریں اور آنکھوں سے باہر جھانکتی زبان اس ذکر کو یہیں ختم کرنے کے لیے کہتی تھی۔ پرتیسری ٹڈل کلاسی کو یہ سب منظور نہیں تھا۔

میں پتھروں کی ہوزری دیکھتی تھی۔ زون (شراب بنانے والا آلہ) کے بارے میں سننتی تھی۔ انگوروں کے پاؤں سے کچلے جانے کے عمل کی تفصیل جان رہی تھی۔ وادی کا ہر گھر اس معاملے میں خود کفیل ہے۔ نیز تہواروں پر چترال کے مسلمان بھی بلا تکلف شراب پینے یہاں آتے ہیں۔

”بس کرو اب۔“ کوثر پنجابی میں چلائی۔ مسز ممتاز چلنے کے لیے کہتی ہیں۔

وہیں شراب کی ہوزری کے پاس میں نے بودلک کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔“  
زمانہ بڑرا اس رسم کو ختم ہوئے۔ اب کوئی بودلک بھی زندہ نہیں جسے آپ کو دکھایا جائے۔“ شیر بیگ نے زمانہ سے کہا۔

”مجھے یقین نہیں۔“ قطعیت سے پرمیرا جواب تھا۔

”معاشرے کے تہذیبی ارتقاء میں رسوں کا ختم ہو جانا اور نئی کارواج پانا کچھ ایسا بھی

غیر معمولی نہیں جس پر آپ کو اعتبار نہ آئے۔“

شیر بیک کی دانائی سے پُر اس بات نے مجھے قائل تو ضرور کیا پر میری آنکھوں میں تذبذب تھا۔ سوال تھے۔ اور کچھ جاننے کی شدید خواہش۔ میں نے کوثر لوگوں سے وادی کو دیکھنے کے لیے کہا۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ اب وہ اس نئے افسانے کو سنے جس کی حقیقت جاننے کے لیے مجھے اُچھل پڑے لگے ہوئے تھے۔

اب یہ مشکل کام تو آپ کو ہی کرنا ہے۔ میں نے کمرے میں آنے اور بیٹھنے کے بعد کہا۔ وادی کی عورتوں کے ساتھ تو زبان یا رمن ترکی و من ترکی نمی وانم والا معاملہ ہے۔

تب وہ بولے۔

جب انسانی وجود کے آر پار کو کسی برچھی کی انی کی طرح چیرتی نورستان کے پہاڑوں سے آنے والی زمستانی ہوائیں دم توڑنے لگتیں تب بودلک کے چناؤ کے لیے سمسن جیسے جری جوان کا انتخاب ہوتا تھا۔ اُسکے انگ انگ کی صحت مندی کی سند وادی کے وید حکیم کے جاری ہونے کے بعد پہاڑ کی چوٹی پر ایک الگ تھلگ گھر میں چھ ماہ تک بہترین کھانوں اور پھلوں کے ساتھ پرورش اور صنف مخالف سے میل ملاپ نہ کرنے کی نگرانی کرنا وادی کے لوگوں کا ایک مقدس مشن تھا۔

پھر ایسے ہی دنوں میں جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برفیں آبشاروں کی صورت وادی کو نہال کرتی تھیں جب پھولوں کے خوش رنگ چہرے اسکاُسن بڑھاتے تھے جب انگوروں کی بلیں ریلے خوشوں سے لدی پھندی آنے والے دنوں میں سرور کے نئے رنگوں کا پیغام دیتی تھیں۔

وہ کسی آسمانی دیوتا کے سامان وادی میں اُترتا تھا۔ اُس بادل کی طرح جس کے ایک ایک

آبی قطرے میں دھرتی کو گل رنگ کر دینے کا جادو ہوتا ہے۔ تب سولہ سنگھار کئیے حسینائیں آنکھوں میں محبت و عقیدت کے جام بھرے مردوزن پیر و جوان بچے بوڑھے اسکے قدموں تلے پھول بچھاتے اُسے چار سو (ڈانس ہال) لے آتے۔ جہاں جلتی مشعلیں رات کو دن بنا رہی ہوتیں۔

ڈھول کی ڈھما ڈھم پر رقص اور مے نوشی کہ ساری کائنات تو بس سٹ کر جیسے ان لمہوں میں مقید ہو جاتی۔ بارہ کا گجر۔ حسیناؤں کے چار سو سے جانے کی گھڑی کا اعلان ہوتا۔ جیسے کوئی کانچ کا کھلونا تھا مے۔ یوں ڈبلول (مذہبی رہنما) بودلک کو پکڑے لڑکیوں کے پاس جاتا۔

تب گل چینی کا عمل شروع ہوتا۔ لڑکیاں پھول ہی تو ہوتی ہیں۔ تاروں کی طرح چمکتی۔ پہلی لڑکی۔ پہلا تارہ ٹوٹتا ڈبلول چار سو میں طبل بجاتا۔ لوگ سرمستی اور سرشاری میں رقص کو تیز کر دیتے۔ تارے نوتے جاتے اور یوں صبح ہو جاتی۔ تمیں لڑکیوں کی گل چینی اُس شب بودلک کے لیے بے حد ضروری ہوتی تھی۔

”اس رسم یا عقیدے کی کوئی توجیح یا فلاسفی تو یقیناً آپ لوگوں کے ذہنوں میں ہوگی ہی۔“ میں نے پوچھا تھا۔

”بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارا یقین ہے کہ بودلک کے وجود سے انسانی و حیوانی نباتاتی و جماداتی زندگی کے سوتے اُبل پڑتے ہیں۔ وہ وادی کو خوشحالی کی پھوار میں بھگودیتا ہے۔“

”جب ایسا اندھا یقین ہے تو پھر یہ ختم کیسے ہوگی۔“

”کئی بدلتی قدریں۔ وقت اور نئی نسل جسے یہ سب خرافات نظر آتی ہیں۔“

پھر میں اُنکے گھر کی بلندی سے نیچے آئی۔ انگور نہ کھا سکنے کا میرا ڈکھ۔ کنوئیں کے پاس آ کر پیا سے آدمی کا مٹھا پانی نہ پی سکنے کا افسوس میری بار بار کی چچ چچ نے شیر بیگ کا دل یقیناً مسج کر رکھ دیا ہوگا۔ تبھی وہ ہنستے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”ایک نکتہ بتا دیتا ہوں۔ اُس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں تو اٹھا لیجیے۔“

بیلوں سے کچھا توڑے بغیر دانہ دانہ کر کے کھالیں۔ آپکے ہاتھ میں ثبوت نہیں ہوتا

ساری شام پرنس اسد الرحمن کے ساتھ گزری۔ خاندانی الہم اُس مہ لقا کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھنے کی چاہت میں گزشتہ چند سالوں سے میں مری جا رہی تھی۔ الہم میں ایک اور مہ لقا کی بھی وضاحت ہوئی۔ وائی ہنزہ میر غضنفر کی ہمیشہ پرنس اسد کی سابقہ منگیتر۔ نظریں تو اس پر یوں چپک گئی تھیں کہ ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک لمبی داستان تھی اسکی منگنی کے ساتھ جو سنسنی پڑی۔

جب شام ڈھلے گھر آئے تو لان میں تاج صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ایک نوجوان سے تعارف ہوا۔ محکم الدین ایونی چترال کا ذہین آرٹسٹ۔ خاصی دیر باتیں ہوئیں۔ رات کے کھانے پر چترالی سوپ نے لذت دی۔ ترکیب نوٹ کی۔ چوتھے نمبر والی بیٹی جس کی ساری سہ پہرا اسکی تیاری میں گزری تھی کو شاباش دی۔

صبح اتر پورٹ جا کر چانس پریٹ کے لیے کوشش کی پر ناکام رہے۔ اگلے دن فلائٹ نہیں آئی۔ اس سے اگلے دن بھی نہیں۔ سامان اٹھا کر جانا اور شرمندگی کا طوق چہرے پر سجائے واپس آنا کس قدر ذلت آمیز تھا۔ اب ہمیں کسی ہوٹل جا کر اپنے میزبانوں کی رسوائی بھی گوارا نہ تھی۔

”پروردگار“ میں نے ہندوکش کے پہاڑوں میں گھرے نیلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا ہمارے حال زار پر رحم کر۔ کوثر لواری ٹاپ سے سفر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس معزز اور شریف گھر نے سارے چترالی اور میدانی کھانے ہمیں پکا پکا کر کھلا دیئے ہیں۔ اب اٹنے پاس ہمیں کھلانے کے لیے کوئی نئی ڈش نہیں۔

رحم میرے مولا ہم پر اور ہمارے میزبانوں پر۔

اور اگلے دن ہم پر رحم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سلمیٰ اعوان

971 آشیانہ دہلی روڈ

لاہور چھاوٹی

چاہیے۔“

خدا حافظ کہہ کر وادی میں بقیہ لوگوں کو ڈھونڈنے لگی۔ سی این ڈبلیو ریٹ ہاؤس کے پاس ہی ٹکراؤ ہو گیا۔ خوشی سے چہکتے ہوئے انہیں راز کی بات بتائی۔  
ڈرائیور یہاں سے واپسی چاہتا تھا پر زہرہ ممتاز کا وادی کے حسن و رعنائی پر واری صدقے ہونا اور اگلی وادیوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرنا میرے لیے بہت طمانیت کا باعث تھا۔

نور و خاصی بڑی وادی ہے۔ یہاں ڈپنٹری ٹڈل سکول دوکانیں اور ہوٹل ہیں۔  
جب آگے چلے اور وادی کی مختصر سی بھیڑ بھاڑ سے نکلے۔ تو پھر انگور تھے ہم تھے۔ چشمے کے ٹھنڈے نھار پانیوں سے کچھ دھوئے اور کھائے۔ ڈین کی تو دھجیاں اڑائیں۔  
اگلی وادیاں بھاڑ اور بہاڑ تھیں۔ بھاڑ میں ہم نے ہوٹل کے سامنے دھری چار پائیوں پر بیٹھ کر چائے پی اور بہاڑ سے نورستان کے سرسبز و شاداب جنگل دیکھے۔  
گلیشروں سے لدے پھندے پہاڑوں نے مسحور کیا۔ افغانستان کے علاقے نورستان کے متعلق جانا۔ نورستانی چراگا ہوں میں کالاشیوں کے ڈھور ڈنگروں کا رہنا چہا اور کالاشیوں کا دودھ بھی جوڑ جوڑ کر نیچے لانا سب سنا۔

اور جب واپسی ہوئی مسز زہرہ ممتاز نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔  
”میں شکر گزار ہوں آپ کی۔ بخدا میں نے فردوس بریں کی سیر کی۔“

## الوداع چترال

### اور اہل چترال

الصلوة خیر من النوم پہلی بار آہستہ پر دوسری بار اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے کوثر اٹھ

بیٹھی تھی۔

میرے جسم کی حالت کچھ اُس مظلوم عورت کی سی تھی جس کے خاوند نے اُسے چار چوروں کی مار ماری ہو۔ بریر کی جنت نظیر وادی کے خوفناک راستے بدن کے لیے جیسے ظالم شوہر کا ڈنڈا ہی تو ثابت ہوئے تھے۔ آنکھ کی خفیف سی جھری سے میں نے کوثر کو دیکھا اور پھر اُسے بند کر لیا۔ نئے نکور کبیل کی تنہی سی گرمائش دیکھتے شریر کے لیے نکور کا کام کر رہی تھی۔

کوثر کی کھٹ پٹ نے مجھے مجرم سا بنا دیا تھا۔ اُسکی اللہ میاں سے یاری کی فلاسفی میں نماز کی ایک چھٹی بھی اُس تیز دھار والی قینچی جیسی ہے جو محبت کو بھیتی بھیتی کر ڈالتی ہے۔ اس کے چھوٹے بچے نے اگر کبھی شامت اعمال سے رات کو پیشاب کر کے اُسے گیلا کر دیا تو پوہ ماگھ کی راتوں میں اس نے اپنے ساتھ بچے کو بھی تل کے نیچے کھڑا کر دیا۔

جب وہ وضو کر کے آئی تو اس نے عین میرے سامنے سر پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔ باجی فجر

کی نماز چترال شاہی مسجد میں پڑھنی ہے۔

اب باجی کو مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اٹھنا پڑا تھا۔

شاہی مسجد میں نماز کی ادائیگی میں عبودیت کی انکساری عین اپنے عروج پر تھی۔ لطف

آیا۔ واپسی میں دن چڑھ چکا تھا۔ مہمان خانے سے اندر زنان خانے آ گئے۔ برآمدے میں کرسی پر تاج صاحب بشاش بشاش بیٹھے ریڈیو سنتے تھے۔ مسز تاج چائے بنانے میں مصروف اور بڑی بیٹی راتھنی میں ناشتے کے لیے چیزیں رکھتی تھی۔

کیسا محبت بھرا گھر اُن تھا۔ چہروں پر جو مسکراہٹیں سجی تھیں اُن میں خلوص کی دمک تھی۔ ناشتے کے لوازمات شیر اشاپیک (اخروٹ خوبانی اور دودھ کے آمیزے سے بیک کی ہوئی روٹی) پر اٹھے انڈے اور قبوہ چائے دونوں موجود تھے۔

تاج صاحب نے اُس دن کا پروگرام جاننا چاہا۔

”گیارہ بجے تک تو آپ کے ساتھ نشست جمے گی۔ بعد میں کل والی پارٹی کے ساتھ

بہوریت کا پروگرام ہے۔“

”آپ تو پہلے بھی وہاں جا چکی ہیں اور کتنی بار جانا ہے۔“ کالاش وادیوں کی طرف

بھاگ بھاگ کر جانا شاید ہر چترالی کی طرح انہیں بھی اچھا نہیں لگا۔

”تاج صاحب مفت کا ٹرپ ہے اور آپ جانتے ہیں مفت کی شراب تو قاضی نے بھی

پی لی تھی۔“

چترال کا چہرہ میرے لیے اب خاصا شناسا تھا۔ اس شناسائی میں مزید اضافہ اس صبح

تاج صاحب کی گفتگو نے کیا۔

سیاسی جغرافیائی اور دفاعی نظر سے چترال پاکستان کا اہم ترین صوبہ ہے اسکی سرحدیں

چین افغانستان اور تاجکستان سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ اگر ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں

میں مقید ہے تو وہیں مختلف دروں سے باقی اضلاع سے ملا ہوا ہے۔

بے شمار گلیشٹروں میں سے اہم چیانٹار ہے جو ۲۵ میل لمبا اور کوئی تین میل چوڑا ہے۔

چترال کے کلچر اور تہذیب پر وسط ایشیا کی ریاستوں کا گہرا اثر ہے کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف

نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے۔ ان قبائل میں کھو، بشگالی، گواری، کالاش، دامیٹری،

ڈانگرک، پٹھان واخی اور بدخشی ہیں۔ کھواکشریتی قبیلہ ہے جو قدیم آریائی واخان چینی ترکستان افغانستان اور دیر سوات سے آنے والے لوگوں کے یہاں آکر رہنے اور قبول اسلام کے بعد باہم شادیوں اور میل ملاپ کے باہمی ربط سے تشکیل پایا۔ انکی زبان کھوار ہے جو کم و بیش پورے چترال میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بشگالی دراصل افغانستان کے سرخ کافر تھے۔ جو انیسویں صدی کے آخر میں بھاگ کر چترال آئے۔ مسلمان ضرور ہیں مگر ان میں ابھی تک جہالت اور وحشی پن موجود ہے۔ بکرے کے پوست سے تیار کردہ پوسٹین پہنتے ہیں۔ سر پر پکول نمائوپی رکھتے ہیں۔ سردیوں کا لباس بور (بے آستیں چونڈ) ہے۔ مردوں کو سر کے بال لمبے رکھنے کی عادت ہے۔ ہڈی حرام اور کام چور سے ہیں۔ گھر کی گاڑی چلانے کی ذمہ داری تمام تر عورت کے ذمہ ہے۔ لڑکی جب بیاہ کر سسرال جاتی ہے تو میکے میں گزارے گئے سالوں کا تاوان وہ شوہر کی زمینوں پر محنت سے کام کر کے ادا کرتی ہے۔

پروردگار عورت کے معاملے میں کتنے ظالم ہیں لوگ۔ مسلمان ہو کر بھی جاہل رہتے ہیں۔ کوثر بے اختیار ہی بول اٹھی تھی۔

گواری جنگجو قسم کے اجڈ لوگ ہیں۔ نسل در نسل دشمنیوں کے چکر میں الجھنے والے اس قبیلہ کا پیشہ مویشیوں کی چرائی ہے۔ واخی چین کے علاقے سکلیانگ افغانستان کے واخاں اور تاجکستان سے آنے والے لوگوں کی قوم ہے۔ زبان بھی ونخی ہے۔ فطرتاً ہی لوگ ہیں۔

چترالی رقص و موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ پولو میں انکی جان ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر اب میدانی علاقوں کا رنگ غالب آنے لگا ہے۔ تاہم چند مقامی رسمیں ابھی بھی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جن میں بارات کے ڈلہن کے گھر پہنچنے پر چھڑی کا پھینکا جانا جسے جو کوئی پکڑے انعام پائے اور ڈلہن کا دولہا کے گھر پہنچ کر سواری سے اس وقت تک نہ اترتا جب تک کہ ساس اور سسرال کے لیے تحائف کا اعلان کریں۔ ڈلہن کا میٹھی روٹیاں پکانا اور ڈولہا کا انہیں پلٹا دینا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم لوگ پامیر ہوٹل گئے جہاں سے بمبوریت کے لیے روانگی ہوئی۔

نکلی تیس ڈوب کر لطیف ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے ہم جدا ہوئے۔  
 ہمارے لیے تاج صاحب کا گھر گھر سے باہر گھر جیسا آرام اور سکھ لیے ہوئے تھا۔  
 مہمان خانے کے سامنے چھتھنار درختوں کے جنگل کی عقبی سمت کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ  
 پھیل جاتی تب ہم اندر جاتے۔ اس وقت نہم میں پڑھنے والی حنا سکول کے لیے بیگ سیٹ کرتی  
 سب سے چھوٹی آٹھ نو سالہ لاڈو بیٹی سوٹی باپ کے ساتھ چھلیں کرتی اور مسز تاج چوٹی ریٹنگ  
 والے برآمدے میں چائے تیار کرنے اور نازک سی ہنس مکھ بیٹی ناشتے کے اہتمام میں مصروف  
 ملتیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر جب ہم جانے کے لیے اٹھے مسز تاج بولی تھیں۔ ”رات کا کھانا  
 گھر پر کھانا ہے۔ بیٹی آج قلی (چترالی سوپ) بنائے گی۔“

مہمان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کوثر نے کہا تھا۔ ”آپ نے مسز تاج کے لہجے  
 میں چھلکتے محبت کے رچاؤ کی شدت کو محسوس کیا۔ کیسی دریا دل عورت ہے۔“  
 پورا گھر ہی خلوص کے شیرے میں لٹھڑا پڑا ہے۔ رحمت کی بجائے اب ہم زحمت والے  
 خانے میں داخل ہو گئے ہیں۔ پر پھر بھی انکے چہرے پیار بھری مسکراہٹوں سے ”آپ کا اپنا گھر ہے“  
 کا پیغام دیتے ہیں۔ ہاتھ ہیں کہ دسترخوان نئی نئی چیزوں سے سجاتے کہتے ہیں۔ ”ارے آپ  
 اپنے حصے کا رزق کھا رہی ہیں۔“

چترال بازار پہنچ کر جو نہی کوثر نے اپنے پرس سے کاغذ نکالا میں توجی جاں سے دمل گئی۔  
 گرم چشمہ کی پٹی والی واسکٹیں اپنے بچوں اور عزیزوں کے لیے تو ضروری تھیں پر یہاں تو سہیلیوں  
 کے شوہروں کے لیے بھی لمبا چوڑا نمبر تھا۔

کوئی ڈیڑھ بجے شاہی بازار کی نلکو والی چھوٹی سی دوکان سے بیسن میں تلے آلو پیسی  
 کے ساتھ کھائے اور سول اسپتال کے پاس میونسپل لائبریری گئے۔ لائبریری میں کتابیں بھی تھیں  
 اور پڑھنے والے بھی۔ اہل چترال کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ لائبریرین کے اس جملے میں  
 ملانہ تفاخر تھا۔

گاڑی کا ڈرائیور مقامی تھا۔ جس نے آیون گاڑی روک کر ہمیں وہ راستہ دکھایا جو فاریسٹ والوں نے بمبوریت تک کھرہ کے جنگل سے پہاڑوں کے گرداگرد کاٹ کر بنایا تھا۔ یہ راستہ دشوار گزاری اور خوبصورتی دونوں لحاظ سے بے مثال تھا۔ پتہ نہیں اسے کیوں بند کر دیا گیا۔

بمبوریت میں سچی بات ہے ویرانی کی دھول اُڑتی تھی۔ سارے میں اُداسی اور بے کیفی کی فضا تھی ہوئی تھی۔

کراکال میں جرمن حکومت کے تعاون سے ایک بڑا ٹیکنیکل کالج بن رہا تھا۔ کراکال کی بشالینی بھی گریک منسٹری آف فارن آفیسرز کے تعاون سے بنی ہوئی تھی۔

یہ وہی بشالینی تھی جہاں تا کا جھانگی ممنوع تھی۔ اور اب ہم نے اسکے ایک ایک کمرے کو دیکھا تھا۔ میسنری ہوم کو جدید سامان سے آراستہ دیکھ کر باغ باغ ہوئے۔ فائو سٹار ہوٹلوں جیسے ہاتھ روموں کو استعمال کر کے خوشی ہوئی۔ کالاشیوں کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی یقیناً قابل رشک تھی۔

مسز زہرہ ممتاز بمبوریت دیکھ کر بہت مایوس ہوئیں۔ میں نے کہنا ضروری سمجھا تھا

”دراصل آف سیزن ہے۔ خزاں کی آمد ہے وگرنہ وادی کی خوبصورتی میں کوئی شبہ نہیں۔“

جب واپسی میں چترال داخل ہوئے تو پولو گراؤنڈ میں اتر گئے کہ وہاں جوم عاشقان تھا۔ تیز ساز والی موسیقی کی تانیں تھیں۔ پلے ہوئے خوبصورت گھوڑوں پر بیٹھے رعنا جوان برق کی مانند نہیں بھگائے پھرتے تھے۔ دھرتی طیریا کے مریض کی طرح کانپتی تھی۔ پولو کا میچ عروج پر تھا۔ کسی نیم کا گول ہوا لوگوں کے نعروں کے شور اور بینڈ کی چیخنی چنگھاڑتی موسیقی نے کانوں کے پردے پھاڑنے والا کام کیا تھا۔

ہماری بمبوریت والی بوریٹ کہیں بھاگ گئی تھی۔ اس سنسنی خیز اور خون کو کھولانے والے کھیل سے ہم نے لہجہ بہ لہجہ مسرت کشید کی اور اپنے آپ کو سرد کیا۔

جب یہ سارا کھیل تماشا ختم ہوا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ چترال کی شام